ISSN 0974-7346

اپریل ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹ — عدد ۴

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپئے۔رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپئے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپئے۔دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپئے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔
ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۵۰۰؍روپئے ہے۔
اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰روپئے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔
اس لئے فی الحال معارف کی ترسیل پاکستان کے لئے موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:
Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100
بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:
Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Mobile. (Ma’arif Section) 0-7607046300 / 0-9170060782
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ شعبان۔رمضان ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۲۲ء | عدد ۴

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

گزشتہ دو تین صدیوں سے دنیا کئی مادی و معاشی نظاموں کے نظاروں میں اپنے وجود کی تلاش میں جس طرح سر گرداں ہے، انسانی تاریخ کے حافظہ میں شاید ہی ایسے ذہنی و فکری فساد و انتشار کی کوئی اور مثال ملے۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ، دراصل ان نئے نظاموں کی بنیاد بنی۔ ان کے ذریعے یورپ نے ساری دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیابی حاصل کی کہ انسان کے فکری، تہذیبی اور معاشرتی مسائل کا حل اگر کہیں ہے تو وہ مذہب نہیں، اخلاقیات نہیں بلکہ صرف اور صرف فلسفہ معاشیات میں ہے۔ قدیم مذہبی اور سماجی نظریات اور رویوں میں سرمایہ داری تنہا معاشی فکر کی علامت تھی لیکن مغرب کی مذہب، روایت اور اخلاقی اقدار سے بیزاری نے سرمایہ داری کے ساتھ سوشلزم، کمیونزم جیسے فلسفوں کو الگ الگ خطوں کی خاص فضاؤں کی مناسبت سے بھی رائج کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان فلسفوں کے علاوہ ایک اور نظریے کو بھی عملاً اپنایا گیا۔ یہ فسطائیت کا فلسفہ تھا، جس میں کسی ملک کی انفرادی قوت اور زمین کی دولت کے سہارے نسل پرستانہ جذبات کو ہوا دے کر اپنی فوجی طاقت کے اظہار کو ہوا دی گئی۔ تین چار صدیاں گزر گئیں، یورپ کا تفوق ان ہی نظریات کی مدد سے پوری دنیا پر الگ الگ صورتوں میں پھیلتا اور بڑھتا گیا۔ صدیوں کا سفر جتنا آگے بڑھتا ہے شاید اتنا ہی وہ خود کو دہراتا بھی رہتا ہے۔ تاریخ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے بس یہی کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ضرور ہے۔ لیکن یہ خاموشی کسی مجبوری کے تحت روا نہیں رکھی جاسکتی۔ نظام قدرت کا یہ آئین غور و فکر کا طالب ہے۔

***

نظام قدرت کے اس اصول کی ایک مثال، مغرب سے قریب تر مسلم ریاست ترکی کی تاریخ میں ملتی ہے۔ ۱۸۳۹ء کا زمانہ تھا جب سلطان عبدالمجید خاں کا دور اقتدار تھا۔ سلطان نے قومیت کے نعرے سے آزاد ہونے کے لئے کچھ اصلاحات کے نفاذ کا منصوبہ بنایا کہ اچھی حکومت اور بامعنی جمہوریت کے ذریعے سے اس قومیت سے نجات مل سکے گی جس نے ترکی مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی نفرت میں شدت پیدا کر دی ہے۔ سلطان کی کوششوں سے ملک کے حالات سنبھلنا شروع ہوئے اور ترقی کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے۔ لیکن

ملک کی ترقی اور اس کا عوامی اتحاد، قریب کے ملک روس کو راس نہیں آیا تو اس نے ۱۸۴۹ء میں ترکی سے کچھ ناقابل عمل مطالبے کئے، پورا نہ ہونے کی صورت میں اس نے جنگ کی دھمکی دی۔ جنگ چھڑنے والی تھی کہ برطانیہ نے ترکی میں اپنے مفادات کے پیش نظر روس کے خلاف ترکی کی مدد کا اعلان کر دیا۔ کئی سال تک یہ آویزش سیاسی طور پر زیادہ اور فوجی لحاظ سے کچھ کم جاری رہی۔ درمیان میں ترکی نے روسی فوجوں کو ان ہی مقامات پر شکست دی جن کے کچھ نام موجودہ روس، یوکرین کے خونی تصادم میں بھی نظر آتے ہیں۔ آخر کار ۱۸۵۶ء میں جب روس کی طاقت کمزور ہوئی تو وہ صلح پر مجبور ہوا اور پیرس میں ایک معاہدہ عمل میں آگیا۔ بات روس و یوکرین کی ہونی تھی، لیکن ذکر ترکی کا آگیا۔ ترکی سے رشتہ واقعی ایسے اندیشہ ظاہر کرتا ہے جو ماضی میں کئی بار سچ ثابت ہوئے۔ یوکرین اور ترکی کا رشتہ بڑا پرانا ہے۔ سترہویں صدی میں یوکرین ترکی خلافت کا حصہ تھا۔ روس اس وقت بھی یوکرین کا دعویدار تھا اور پھر وہ قابض بھی ہو گیا۔ آج جب کہ دنیا کے تمام ذرائع ابلاغ روس، یوکرین جنگ کے ایک ایک پل کی تباہیوں کی داستان سنا رہے ہیں اور آج کے سننے والے اور دیکھنے والے، الزاموں اور جوابی دعوؤں کی گھن گرج سے کچھ اس طرح متاثر بلکہ خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ گویا یہ ان کے لئے کوئی نیا تجربہ ہے۔ لیکن اگر تاریخ سے رشتے مضبوط ہوتے اور ظالموں اور مظلوموں کے درمیان ان فاصلوں کو دیکھا جاتا جو مذہب اور اخلاقیات سے عاری ہونے کے بعد محض، دولت، سرمایہ اور معاشی بالادستی سے عبارت ہیں تو شاید اتنی حیرت نہیں ہوتی۔ یورپ نے انسانیت کی قبا چاک کرنے اور اپنے ہی ہاتھوں ناپائیدار آشیانوں پر انحصار کرنے کی جو ریت اپنائی اور جو روایت قائم کی اس سے پوری دنیا کے علاوہ خود یورپ کی ہنگری، پولینڈ اور سلاوی اور بلقانی ریاستوں کو لہو میں نہلاتی رہی۔ سرمایہ داری اور نجی منفعت کے شعلے بلند ہوتے رہے۔ آج یوکرین میں بچے بوڑھے، عورت، مرد ہر وجود تصویر غم بنا ہوا ہے۔ دنیا کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظاموں میں اقتدار، رنگ، نسل اور زبان کی آگ بھڑکانے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہاں مظلوموں کی حمایت میں بھی الفاظ نکلتے ہیں تو رنگ اور نسل کی دہائی کے ساتھ۔ تاریخ سے بے اعتنائی، کیسے کیسے مظالم کا جواز عطا کرتی ہے۔ یوکرین کی جنگ صرف ایک طاقتور پڑوسی کی پسند و ناپسند کا نتیجہ نہیں۔ دسویں صدی ہجری کے وسط میں کییف کا شہر مرکزی حیثیت سے آباد ہوا، گیارہویں صدی میں یہ پورا علاقہ اپنے انتہائی عروج پر نازاں تھا، لیکن یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے اثر نے قومیت کا جو بت تراشا، اس نے یوکرینی زبان و ادب کے حوالے سے بنام قومیت ایک لسانی خطہ کی تشکیل دی

اور پھر وہیں سے خام لوہے، میگنیز، پٹرول، معدنی نمک، فاسفیٹ اور قدرتی چشموں کی دولت سے مالامال ریاست روس کے قیاصرہ اور پھر کمیونسٹ حکمرانوں کے فلسفہ اقتدار کے بدلتے منظر دیکھنے میں خود اپنے وجود کے نقوش کو کھوتی چلی گئی۔ آج جو ہو رہا ہے کیسے کہا جائے کہ ترکی اور پھر دوسری قریبی مسلم ریاستیں اس کی زد سے محفوظ رہیں گی۔ کمال ہے کہ تنازعہ روس اور یوکرین کا ہو اور وجہ نزاع تاتاری مسلم ریاست قرم (کریمیا) بن جائے۔ مغرب کے فلسفوں سے اس کے علاوہ کیا توقع رکھی جائے۔

***

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہے گی اور اس حقیقت کے اٹل اور غیر مبدّل ہونے کا اعلان بھی کرتی رہے گی کہ انسانی شرف و عظمت کے اصل ستون مذہب کی اخلاقی عمارت کو سنبھالتے ہیں۔ یہ نہیں رہیں گے تو صرف حب جاہ واقتدار کے لئے میدان خالی ہو جائے گا اور اس کا نتیجہ ظلم وزیادتی اور فساد فی الارض کے سوا کچھ نہیں۔ فساد فی الارض کی ایک شکل یہی ہے کہ دنیا کی چند بڑی طاقتیں، باقی دنیا کے کمزور ملکوں اور قوموں کو اپنا غلام بنانے کے لئے مالی، فوجی، تکنیکی اور تعلیم وصحت کے نام سے امداد کے بہانے اختیار کرتی ہیں۔ زر اصلی اور زر مبادلہ اور ایک کرنسی کے نام پر غریب ملکوں کے عوام کا استحصال خود ان عوام کے نمائندوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ مقامی نمائندے قومیت، افرادی قوت اور روایتی تہذیب کے احیاء کے نام پر خود اپنے عوام کے دشمن بن کر مغرب کے کرگسوں کے جھنڈ میں شریک ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کرگسوں میں بھی ایک مستقل رقابت اور کشمکش پیدا ہو کر سرد جنگ کی آگ میں بدلتی رہتی ہے۔ بس ایک جذبۂ مسابقت سارے جذبوں پر حاوی ہو کر وہی کچھ دکھلاتا ہے جو آج دنیا روس و یوکرین کے عنوان سے دیکھ رہی ہے۔ تاریخ کا سب سے سچا صحیفہ اور انسانی جذبات کا سب سے بڑا نباض واقعات کو دیکھنے کے ساتھ اصل اسباب پر نظر کرنے کی تلقین یوں ہی نہیں کرتا۔ تاریخ کا مطالعہ فاقصص القصص ہے تو نتیجۂ مطالعہ کا تقاضہ لعلہم یتفکرون (الاعراف ۱۷۶) ہے۔

***

مقالات

تاریخ ہند کے تناظر میں شبلی کی تاریخی بصیرت

ڈاکٹر علاء الدین خاں*

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

khanislahi66@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ـ۱۹۱۴) کا اصل میدان تصنیف وتالیف تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین اور کتابیں لکھیں۔ تاریخ، سوانح، فلسفہ، علم کلام، ادب، سیاست و سیرت سبھی کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا۔ ان کے تصنیفی کارنامے بڑے وقیع اور متنوع ہیں۔ گو علامہ شبلی جامع کمالات شخص تھے لیکن اصلاً وہ مورخ اسلام تھے۔ شبلی کی وفات سے ایک سال قبل ۱۹۱۳ء میں نقاد میں ایک مضمون ''ملک میں تاریخ کا معلم اول'' شائع ہوا۔ اس میں لکھا تھا: ''شبلی ہم میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخ وفلسفہ میں ربط باہمی پیدا کیا، اوران جواہر عقلی کی تحلیل وترکیب اس طرح کی کہ لٹریچر میں ایک خاص مزاج پیدا ہو گیا''۔

بقول خلیق احمد نظامی: ''شبلی نے تاریخ کا ایک وسیع نظریہ اور تحقیقی اصولوں کے گراں قدر پیمانے دیے، عمرانیات کے بنیادی شعور کو تاریخ کی روح سمجھ کر بیدار کیا، اور ادبی ذوق اور نفسیاتی بصیرت سے فکر انسانی کو سمجھنے کا کام لیا''۔[۱]

فن تاریخ نویسی میں شبلی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عربی، ایرانی اور مغربی نظریہ ہائے تاریخ کو ایک فکری وحدت میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا کہ اس میں عربوں کی حقیقت نگاری، ایرانیوں کا ذوق ادب اور مغرب کا انداز تحقیق شامل ہو گیا۔ ہندوستان کا کوئی دوسرا مورخ اس امتیاز میں ان کا شریک نہیں ہے۔

عرب مورخین اصول اسناد پر عمل کرتے تھے لیکن اسباب وعلل کا رشتہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں

---

* فاضل مضمون نگار نے یہ مقالہ ''شبلی میموریل لکچر'' کے موقع پر شبلی اکیڈمی کانفرنس ہال میں ۲۰ فروری ۲۰۲۲ کو پیش کیا۔ یہ میموریل لکچر قومی کاؤنسل برائے فروغ زبان اردو، حکومت ہند، کے تعاون سے دیا گیا۔

۱۔ رسالہ معارف، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۸۔

کرتے تھے۔ ایران کے تاریخی نظریات تخت و تاج کے گرد گھومتے تھے۔ وہاں صرف شاہی خاندانوں کی تاریخ لکھی جاتی تھی، عوامی زندگی سے مورخ کو کوئی سروکار نہ تھا۔ مغربی نظریۂ تاریخ میں تاریخ کو انسان کی حیات اجتماعی سے سروکار تھا۔ اس میں سیاست، ثقافت، مذہب، ادب، فلسفہ غرض انسانی زندگی اور فکر کے ہر پہلو کو جگہ دی گئی اور ساتھ ہی سبب و مسبّب کا رشتہ بھی تلاش کرنے پر زور دیا گیا۔ بقول خلیق احمد نظامی:

> شبلی نے ان تینوں نظریات کو اپنی تنقیدی فکر کی کسوٹی پر پرکھا، ان کی خوبیوں اور خامیوں سے واقفیت حاصل کی، عالمی تاریخی فکر کے نشو و نما کے جائزہ میں انہوں نے مسلمانوں کے تاریخی اصولوں کی بنیادی اہمیت اور افادیت پر غور کیا اور ان اسباب کو سمجھنے کی کوششیں کی جن کے باعث مسلمان اصول اسناد اور اسماء الرجال کو تاریخی تحقیق کے ستون بنا کر آگے نہ بڑھ سکے اور ابن خلدون جیسا فلسفۂ تاریخ کا ماہر بھی آنے والے مورخین کے طرز تحقیق پر اثر انداز نہ ہو سکا۔[۲]

شبلی نے مذکورہ تینوں نظریات پر غور کرنے کے بعد اپنی الگ سمت متعین کی اور وسیع الذہنی کے ساتھ ہر نظریے سے فائدہ اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی، ایرانی اور مغربی نظریات کا جو حسین امتزاج شبلی کے یہاں ملتا ہے وہ اس عہد کے کسی دوسرے ہندوستانی مورخ کے یہاں موجود نہیں ہے۔

خلیق نظامی کے مطابق ''شبلی کے تاریخی ذوق اور ان کے نظریات تاریخ کے نشو و نما میں چار اثرات سر سید، آرنلڈ، بلگرامی اور سفر ترکی بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں، شبلی کے افکار میں حرکت ان ہی کے ذریعے پیدا ہوئی اور تلاش و جستجو کی نئی راہیں کھلتی چلی گئیں''۔[۳]

مہدی افادی نے شبلی کو ''تاریخ کا معلم اول'' کہا ہے۔ بلاشبہ مورخانہ شعور و بصیرت کے لحاظ سے شبلی اپنے عہد کے ایسے مورخ ہیں جو فن تاریخ کے بارے میں ٹھوس نظریات رکھتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور کتاب ''الفاروق'' کے دیباچے میں باکمال مسلم مورخوں جیسے ابن قتیبہ، واقدی، البلاذری، طبری اور مسعودی کی تعریف تو ضرور کرتے ہیں لیکن اُن لوگوں کی ذہنی تنزلی کا رونا بھی روتے ہیں جو پانچویں صدی میں اِن کے بعد آتے ہیں۔ ابن خلدون (۱۳۲۲۔۱۴۰۸ء) کے علاوہ شبلی سب پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ شبلی کے مطابق ابن خلدون ہی وہ شخص تھے جس نے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ شبلی کے نزدیک تاریخ اصولاً ایک نقلی علم ہے۔ اس لیے فن تاریخ میں واقعات کی روایت کے لیے مستقل سلسلۂ اسناد کی ضرورت ہے اور اسی خصوصیات کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے فن تاریخ کو یورپ کے فن تاریخ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شبلی تاریخ کی تعریف درج ذیل

۲۔ ماخذ سابق، ص ۱۸۹۔۱۹۰

۳۔ ماخذ سابق، ص ۱۹۰۔

الفاظ میں کرتے ہیں": فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کیے ہیں اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے، ان دونوں کے مجموعے کا نام تاریخ ہے"۔[۴]

شبلی نے تاریخ کے لیے جو باتیں لازمی قرار دی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ جس عہد کا حال لکھا جائے اس زمانے کے ہر قسم کے واقعات قلم بند کیے جائیں، یعنی تمدن و معاشرت، اخلاق، عادات، مذہب ہر چیز کے متعلق معلومات کا سرمایہ مہیا کیا جائے۔

۲۔ تمام واقعات میں سبب اور مسبَّب کا سلسلہ تلاش کیا جائے۔[۵]

شبلی نے قدیم تاریخوں کے نقص اور ان کے اسباب بھی بیان کیے ہیں اور تاریخ نویسی کے اصول بھی بتائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قدیم تاریخوں میں مذکورہ دونوں باتیں مفقود رہی ہیں۔ رعایا کے اخلاق و عادات اور تمدن و معاشرت کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں آتا۔ ان میں صرف فرماں روائے وقت کے حالات ہوتے ہیں لیکن ان میں بھی فتوحات اور خانہ جنگیوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ نقص اسلامی تاریخوں تک محدود نہیں بلکہ کل ایشیائی تاریخوں کا یہ انداز تھا اور ایسا ہونا مقتضاء اسباب تھا۔ ایشیاء میں ہمیشہ شخصی سلطنتوں کا رواج رہا اور فرماں روائے وقت کی عظمت واقتدار کے آگے تمام چیزیں ہیچ ہوتی تھیں۔ اسی کا لازمی اثر تھا کہ تاریخ کے صفحات میں شاہی عظمت و جلال کے سوا اور کسی چیز کا ذکر نہ آئے اور چونکہ اس زمانے میں قانون اور قاعدہ بادشاہ کی زبان تھی، اس لیے سلطنت کے اصول اور آئین کا بیان کرنا بھی گویا بے فائدہ تھا۔[۶]

علامہ شبلی مورخ کا اصلی فرض بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مورخ کو چاہیے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کرے[۷]۔ مورخ کو اجتہاد اور قیاس سے چارہ نہیں، لیکن اس کا لازمی فرض ہے کہ وہ قیاس اور اجتہاد کو واقعے میں اس قدر مخلوط نہ کردے کہ کوئی شخص دونوں کو الگ کرنا چاہے تو نہ کر سکے۔[۸]

شبلی کے نزدیک واقعات کی صحت کے لیے صرف راویوں کا ثقہ ہونا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ چند عقلی اصولوں کی بھی ضرورت ہے مثلاً:

۱۔ واقعہ مذکور اصول عادت کی رو سے ممکن ہے یا نہیں؟

۴۔ شبلی نعمانی، "الفاروق"، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۲۰، ص ۹-۱۰۔

۵۔ ماخذ سابق، ص ۱۰۔

۶۔ ماخذ سابق۔

۷۔ ماخذ سابق، ص ۱۷۔

۸۔ ماخذ سابق، ۱۷۔

۲۔ اس زمانے میں لوگوں کا میلان عام واقعہ کے مخالف تھا یا موافق؟

۳۔ واقعہ اگر کسی حد تک غیر معمولی ہے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی ہے یا نہیں؟

۴۔ اس امر کی تفتیش کہ راوی جس چیز کو واقعہ ظاہر کرتا ہے، اس میں اس کے قیاس اور رائے کا کس قدر حصہ شامل ہے؟

۵۔ راوی نے واقعے کو جس صورت میں ظاہر کیا ہے، وہ واقعہ کی پوری تصویر ہے یا اس امر کا امکان ہے کہ راوی اس کے پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور واقعے کی تمام خصوصیتیں اس کی نظر میں نہ آسکیں؟

۶۔ اس بات کا اندازہ کہ زمانہ کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے روایت میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کر دیے ہیں؟[9]

شبلی نے واقعات کی درستی کو جانچنے کے دو طریقے بتائے ہیں: روایت اور درایت۔ درایت سے ان کی مراد یہ ہے کہ عقل سلیم کی روشنی میں واقعات کو جانچا اور ماخذ کو پرکھا جائے۔ وہ اس بات کے حق میں بھی تھے کہ اصول اسباب و علل کی روشنی میں واقعات کی ترجمانی کرتے وقت قیاس اور اجتہاد سے کام لینا چاہیے اور اسی باعث انہیں یوروپین مورخین میں عیب نظر آتے ہیں۔ زبان اور محاوروں کے بارے میں ان کا یہ خیال ہے کہ زیادہ سادہ ہونی چاہیے۔ یہی وہ اصول ہیں جو شبلی کے مطابق تاریخ لکھتے وقت پیش نظر رہنا چاہیے۔

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے "الفاروق" سے ایک اقتباس نقل کر کے شبلی پر جو نقد و تبصرہ کیا ہے وہ شبلی کے بحیثیت مورخ ہونے پر کسی دانشور کی پہلی تنقید ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شبلی تاریخ اور انشاء پردازی کی حدوں کو پہچانتے تھے اور ان کے فرق سے واقف تھے"[10]۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے شبلی کا اقتباس درج کیا ہے جو درج ذیل ہے:

مورخ کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری کی حد سے تجاوز نہ کر پائے۔ یورپ میں آج کل جو بڑا مورخ گزرا ہے اور جو طرز حال کا موجد ہے، رانکے ہے۔ اس کی تعریف ایک پروفیسر نے ان الفاظ میں کی ہے: 'اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا، وہ نہ ملک کا ہمدرد بنا، نہ مذہب اور قوم کا طرف دار ہوا۔ کسی واقعے کے بیان کرنے میں مطلق پتا نہیں لگتا کہ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور اس کا ذاتی اعتقاد کیا ہے۔'[11]

درج بالا عبارت کے حوالے سے پروفیسر فاروقی نے شبلی کی تاریخ نویسی پر نقد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی وہ

۹۔ ماخذ سابق، ص ۱۴۔

۱۰۔ ضیاء الحسن فاروقی، شبلی بحیثیت مورخ، اشخاص و افکار، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۶۸۔

۱۱۔ الفاروق، حوالہ مذکورہ، ص ۱۷۔

اصول ہیں، جن پر مورخ کو عمل کرنا چاہیے لیکن افسوس ہے کہ شبلی خود پورے طور پر ان اصولوں کے مطابق اپنی تاریخی کتابیں اور مضامین نہیں لکھ سکے۔[۱۲]

جس عہد میں علامہ شبلی لکھ رہے ہیں اس میں اردو زبان تاریخی سرمایہ سے بالکل خالی تھی۔ مغل خاندان سے متعلق چند کتابیں ضرور لکھی گئی تھیں لیکن دوسرے خاندان بالکل گم نامی کی حالت میں تھے۔ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے فن تاریخ وتذکرہ کی طرف توجہ کی اور اسے معراج کمال تک پہنچایا۔ شبلی نے تاریخ نویسی میں اسلامی تاریخ کو بہت اہمیت دی اور شاہی خاندانوں کا انتخاب کیا مگر اس میں بھی صرف برگزیدہ اصحاب کا، چنانچہ المامون کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

اسلام میں آج تک خلافت وسلطنت کے جتنے سلسلے قائم ہوئے ان میں سے صرف دو نامور انتخاب کر لیے جائیں جو اپنے طبقہ میں عظمت وحکومت کے اعتبار سے اپنا ہم سر نہ رکھتے ہوں، اور ان کے حالات اس ترتیب اور جامعیت سے لکھے جائیں کہ تاریخ کے ساتھ لائف کا مذاق بھی موجود ہو۔[۱۳]

شبلی دنیائے اسلام کو اپنا وطن اور اس کی تاریخ کو اپنی قومی تاریخ سمجھتے تھے۔ المامون کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ حکومت کے کارنامے بڑی آب وتاب سے دکھائے گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔[۱۴]

غالباً یہی وجہ ہے کہ شبلی نے ہندوستان سے باہر اسلام، ناموران اسلام اور ان کے کارناموں کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ تاریخ ہند سے متعلق ان کے چند مضامین جیسے گل بدن بیگم کا ہمایوں نامہ، تزک جہاں گیری، مآثر رحیمی، زیب النساء، مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی، ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر اور ان کی مشہور کتاب "اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر"۔ یہی وہ تاریخی سرمایہ ہے جو انہوں نے ہندوستان سے متعلق تحریر کیا اور آج کا موضوع بھی یہی ہے۔

تاریخ ہند سے متعلق شبلی کی تحریریں اور مقالات مستقل تصنیف کی حیثیت نہیں رکھتے، مگر تحقیق و تفحص اور مواد کے لحاظ سے ان کی حیثیت مستقل تصنیف سے کم بھی نہیں ہے۔ ان مقالات میں شبلی نے یورپ اور ہندوستان کے مورخین کے اعتراضات کا نہایت مدلل اور موثر جواب دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

انگریز مورخین نے اپنی تاریخی کتابوں میں بڑی چالاکی کے ساتھ ہندو مسلم سماجی نظام کے اختلافی

۱۲۔ ضیاء الحسن فاروقی، حوالہ مذکورہ، ص ۶۸۔

۱۳۔ شبلی نعمانی، المامون، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۰۹ء، ص ۷۔۶۔

۱۴۔ ماخذ سابق، ص ۵۔

پہلوؤں کو اجاگر کیا تاکہ ان میں اتحاد و یکجہتی کی راہیں مسدود ہو جائیں۔ ایلیٹ و ڈاؤسن نے آٹھ جلدوں میں *History of India as told by its own historians* کے نام سے جو تاریخ لکھی اس کا مواد انھوں نے عربی اور فارسی کتب سے اس طرح اخذ کیا کہ اختلاف، جنگ و جدل، ظلم و استبداد کو مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہو جائے۔ ایلیٹ کا مقصد تھا کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں کی تہذیبی برتری اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں کا اس طرح احساس دلائے کہ مسلم عہد تاریک نظر آنے لگے۔ شبلی نے انگریز مورخین کی لکھی ہوئی کتابوں سے پیدا ہونے والے اثرات کو بھانپ لیا تھا، اسی لیے انہوں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالے کے لئے چند مقالات لکھے جن کے مطالعہ سے شبلی کی مورخانہ بصیرت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

اورنگ زیب (۱۶۵۸ـ۱۷۰۷) مغل حکمرانوں میں سب سے زیادہ غلط اور گمراہ کن افواہوں کا شکار رہا۔ اس پر مذہب پرست اور کٹّر مسلمان ہونے کے الزامات لگائے گئے اور یہ کہا گیا کہ اس نے ہندوؤں کے علوم و فنون کو تہس نہس کیا، عبادت گاہوں کو منہدم کیا اور ہندوؤں کو ملازمتوں سے محروم کیا، جزیہ لگایا اور ادا نہ کیے جانے کی صورت میں انہیں مسلمان بنایا گیا، اس نے بھائیوں کا قتل، باپ کو قید کیا اور دکن کی مسلم ریاستوں پر حملہ کیا، مرہٹوں کو چھیڑ کر مغل سلطنت کے زوال کی راہ ہموار کی۔ مگر کیا وہ حقیقت میں ایسا تھا یا نہیں؟ شبلی نے اپنی کتاب میں اسی کا مدلل اور موثر جواب دینے کی کوشش کی ہے اور مورخ کی تمام تر ذمہ داریوں کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہیں یہ آگے کی تحریروں سے واضح ہوگا۔

''المامون'' اور ''الفاروق'' یا دیگر تحقیقی کتابوں کے برعکس، ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' شبلی کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جسے شبلی نے اپنے شاگرد مولانا محمد علی جوہر کی فرمائش پر لکھا جو ''الندوہ'' لکھنؤ میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء کے درمیان شائع ہوا۔ یہ سلسلہ وار اور تاریخ وار تصنیف نہیں ہے بلکہ منتخب عنوانات کے تحت لکھا گیا تاریخ نامہ ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ۱۹۰۹ء میں ان مضامین نے کتابی صورت اختیار کر لی اور ۲۰۱۲ء تک اس کے ۱۹ ایڈیشن آچکے ہیں اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔[۱۵]

سر جادو ناتھ سرکار کی کتاب *History of Aurangzeb* پانچ جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی اور دوسری

۱۵۔ محمد الیاس الاعظمی، آثار شبلی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ یوپی جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۸ـ۲۱۹۔

جلد پہلی بار ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شبلی کی ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر''، سر جادو ناتھ سرکار کی کتاب سے پہلے منصۂ شہود پر آئی،البتہ شبلی کے مراجع ومآخذ سرکار کے مقابلے میں محدود تھے۔ عین ممکن ہے کہ وہ مراجع ومآخذ جن تک سرکار کی رسائی تھی اور بعد کے مورخین کو اور بھی زیادہ کتابیں دستیاب ہوئیں، اگر ان تک شبلی کی رسائی ہوگئی ہوتی تو ان کے قلم سے اورنگ زیب کی کوئی اور واضح تصویر سامنے آتی۔

''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں شبلی نے محققانہ اور ناقدانہ انداز میں یہ ثابت کیا ہے کہ ''اورنگ زیب عالم گیر نے مرہٹوں، ہندوؤں، راجپوتوں اور دکن کی ریاستوں اور پھر اپنے بھائیوں کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، وہ کوئی بھی حکمراں ہوتا تو یہی سب کچھ کرتا''[۱۶]۔

شبلی کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔انگریز اور ان کے ہم خیال مورخین نے اس عظیم بادشاہ کے ساتھ بڑی ناانصافی کی۔ شبلی نے تاریخ ہند کے حوالہ سے انگریز مصنّفین خصوصاً الفنسٹن اور لین پول کی تلبیسات پر جو گرفت کی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔مثال کے طور پر اورنگ زیب پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مندر مسمار کیے۔اس کے بارے میں شبلی لکھتے ہیں:

> اسی خاندان میں عادل سے عادل بادشاہ پر یہی فرد قرار داد جرم قائم ہوسکتی ہے یا نہیں؟ باپ سے بغاوت کی، بھائیوں اور بھتیجوں کو قتل کرایا[۱۷]، دکن کی اسلامی ریاست مٹادی، ایک سال کے اندر ۶۵ بت خانے منہدم کرادیے اور ہمیشہ اس پر فخر کرتا رہا۔یہ مسئلہ غور کے قابل ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شاہ جہاں کے الزامات کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں اور عالم گیر کے وہی الزامات افسانۂ بزم انجمن ہیں۔اس عقدے کا حل کرنا اگرچہ ایک تاریخی فرض ہے لیکن اس سے ایک قومی تفریق کو تحریک ہوتی ہے۔[۱۸]

شبلی نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں بعض متنازع مسائل اور واقعات کو جانچا ہے اور مستند تاریخی حوالوں سے یہ وضاحت کی ہے کہ عدم رواداری اور عہد شکنی کے جو الزامات اورنگ زیب پر لگائے جاتے ہیں وہ بے بنیاد ہیں۔انہوں نے اورنگ زیب کے عہد کی مربوط تاریخ ترتیب دینے کے بجائے محض الزامات کا جائزہ لیا ہے اور متعصب مورخین کی افترا پردازیوں کی پول فارسی کی تاریخی کتابوں منتخب اللباب،

۱۶۔سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا شبلی پر ایک نظر، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

۱۷۔شاہ جہاں کا بھائی شہریار اور اس کے بھتیجے طہمورث و ہوشنگ (پسران دانیال) خود شاہ جہاں کے حکم سے قتل کیے گئے: شبلی نعمانی، اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء، ص ۲۔

۱۸۔ماخذ سابق، ص ۳۔۲۔

عالم گیر نامہ، شاہ جہاں نامہ، مآثر عالم گیری، مرآۃ الخیال، خزانۂ عامرہ وغیرہ کی روشنی میں کھولنے اور صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ شبلی نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ اورنگ زیب کے عہد کی یا خود اس کی شخصی تاریخ لکھ رہے ہیں، بلکہ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اورنگ زیب پر لگائے ہوئے الزامات کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں اور ان الزامات کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں ان کو قاری کے سامنے رکھ کر اس سے انصاف کی امید کرتے ہیں کہ وہ تاریخی شواہد کی روشنی میں الزام کی حقیقت یا عدم حقیقت کا قائل ہو۔

زیر مطالعہ کتاب کا پہلا باب ''اورنگ زیب عالم گیر اور دکن'' کے نام سے ہے۔ اس میں شبلی لکھتے ہیں کہ عالم گیر کی فرد قرارداد جرم میں سب سے بڑا واقعہ حیدرآباد کا ہے۔

۱۔ ریاست حیدرآباد ایک شیعہ ریاست تھی۔ اس لیے اس کی بربادی کے تئیں عالم گیر کا سخت مذہبی تعصب ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ حیدرآباد کے مٹنے سے مرہٹوں کو قوت ہو گئی اس لیے یہ سیاسی جرم بھی ہے۔[۱۹]

شبلی نے فارسی ماٰخذ سے حقائق تلاش کیے اور دکن کے استیصال کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''یہ متعصب مورخ (شیعہ) سچ کو نہیں چھپا سکے اور خود انہیں کے مسلمہ واقعات نے بتایا کہ حیدرآباد کا استیصال کرنا کسی اسلامی سلطنت کا نہیں بلکہ ایک مرہٹی سلطنت کا استیصال کرنا تھا''۔[۲۰]

بقول پروفیسر سید جمال الدین:

شبلی دکن کی شیعی ریاستوں کو ''خود مختار ریاستوں'' کے طور پر نہیں دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں اگر وہ ان ریاستوں کا استیصال نہ کرتے تو مرہٹے اپنی ریاست کی توسیع کرتے اور مغلوں کے لیے خطرہ بن جاتے۔ یہ ریاستیں اپنی بقاء کے لیے مرہٹوں کو کمک پہنچاتی تھیں۔ اس لیے اورنگ زیب نے انہیں مٹا دیا۔[۲۱]

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

ہم نے بعض شیعی احباب کو یہ کہتے سنا ہے کہ عالم گیر نے خود اپنی سلطنت برباد کی، کیونکہ دکن کی ریاستیں مرہٹوں کو دبائے ہوئے تھیں، ان کا دباؤ اٹھ گیا تو مرہٹے زور پکڑ گئے۔ لیکن ہمارے دوستوں کو یہ معلوم

۱۹۔ ماخذ سابق، ص ۴۔

۲۰۔ ماخذ سابق، ص ۱۳۔

۲۱۔ سید جمال الدین، ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں شبلی مورخ یا وکیل دفاع یا ترجمان ملت (غیر مطبوعہ مقالہ)۔

نہیں کہ دکن کی یہ ریاستیں مرہٹوں کی گویا باج گذار بن گئیں تھیں اور اگر عالم گیر حیدر آباد اور بیجاپور کو فتح نہ کرلیتا تو آج بڑودہ اور گوالیار کی طرح حیدر آباد اور بیجاپور پر بھی مرہٹوں کا علم لہراتا ہوتا۔[۲۲]

ریاست حیدر آباد کے تعلق سے اورنگ زیب پر جو انگشت نمائی ہوئی اس کا شبلی نے تاریخی ثبوت کے ساتھ مدلل جواب دیا ہے۔ شبلی نے مرہٹے، ہندوؤں کی ناراضگی کے اسباب اور باپ بھائیوں کے معاملات پر الگ الگ باب میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ آخر میں اورنگ زیب کے انتظام سلطنت، ملکی اصلاحات، ٹیکسوں کی موقوفی، قانون مال گزاری اور بندوبست آراضی، عدل و انصاف اور تعلیمات وغیرہ جیسے امور سے بحث کرتے ہوئے اس کے ان محاسن کا بھی ذکر کیا ہے جس سے اس کے ذاتی کردار، شجاعت اور بہادری، مذہبی امور سے دلچسپی اور دیگر اصلاحات پر روشنی پڑتی ہے۔ شبلی نے اورنگ زیب کے ذاتی محاسن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

عالم گیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا۔ اس کی انشاء پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے۔ وہ نہایت سنجیدہ اور متین تھا۔ کبھی نامناسب لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ نہایت رحیم اور وسیع الظرف تھا۔ اہل کمال کا نہایت قدرداں تھا۔ لوگوں سے نہایت اخلاق سے پیش آتا تھا۔ نہایت خشک زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا، لہو و لعب کی باتوں سے قطعاً محترز تھا۔[۲۳]

شبلی اورنگ زیب کی خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں کہ باوجود ان تمام خوبیوں کے عالم گیر میں ایک بڑا عیب یہ تھا کہ وہ اپنی ذاتی شجاعت اور استقلال کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور اسی وجہ سے وہ کسی کو اپنا دوست نہیں بنا سکا۔[۲۴]

شبلی نے اورنگ زیب سے ہندوؤں کے تعلقات اور ان کے ساتھ برتاؤ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ ہندوؤں کی ناراضی اور ان کی عام ناراضگی کے اسباب کے عنوان سے دو باب لکھے ہیں۔ ان دو ابواب میں انہوں نے نہ صرف اورنگ زیب کے احکامات، فرامین اور اصلاحات کا ذکر کیا ہے بلکہ اکبر اور شاہ جہاں کے عہد کے ہندو مسلم تعلقات، جاگیردارانہ نظام، منصب داری نظام وغیرہ کا تفصیلی ذکر کرکے اورنگ زیب کے عہد سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور تمام الزامات کی، بشمول بت شکنی کے، تردید کی ہے۔

اورنگ زیب پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ اس نے بڑے عہدوں سے ہندوؤں کو برطرف کر دیا۔ شبلی نے

۲۲۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، حوالہ مذکورہ، ص ۱۳۔

۲۳۔ ماخذ سابق، ص ۱۲۴۔۱۲۶۔

۲۴۔ ماخذ سابق، ص ۱۲۶۔

مآثر عالم گیری کے حوالہ سے ہندو افسران، جاگیر داروں اور منصب داروں کی ایک تفصیلی فہرست کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ یورپین مورخین اور سیاحوں کا یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ شبلی نے اورنگ زیب کے ہندو عہدے داروں کے جو نام دیے ہیں ان میں سے چند نام مع عہدہ درج ذیل ہیں:

عہدے دار	ولدیت وغیرہ	سن تقرر یا اضافہ عہدہ یا عطائے منصب
راجہ بھیم سنگھ	راج سنگھ مہارانا اودے پور کا بیٹا اور مہارانا جے سنگھ کا بھائی	سن ۳۱ جلوس عالم گیری میں دکن سے آیا اور برہان پور کی مہم میں شریک ہوا، سن ۳۸ جلوس میں پنج ہزاری کے منصب تک پہنچ کر وفات پائی۔
اندر سنگھ	جے سنگھ مہارانا اودے پور کا بھائی	سنہ ۴۳ جلوس عالم گیری میں دو ہزاری ہوا، سنہ ۴۸ میں سہ ہزاری۔
بہادر سنگھ	جے سنگھ مہارانا اودے پور کا بھائی	سنہ ۴۳ جلوس عالم گیری میں یک ہزار و پانصدی ہوا
اچلا جی	شیوا جی کا داماد	سنہ ۳۹ میں پنج ہزاری منصب اور علم و نقارہ وغیرہ ملا۔
کا تھو جی	....	پہلے پنج ہزاری تھا سنہ ۴۹ میں ایک ہزار کا اضافہ ہوا۔
سروپ سنگھ	راجہ اودت سنگھ	سنہ ۴۱ جلوس میں ایک ہزاری منصب پر تقرری ہوئی
سوبھان	ستارہ کا قلعہ دار	سنہ ۴۳ میں پنج ہزاری منصب مع خلعت و نقارہ وغیرہ۔
درگا داس راٹھور	....	۲۹ جلوس میں سہ ہزاری کا منصب ملا۔
کشور داس	ولد منوہر داس گور	۲۶ جلوس میں شولا پور کا قلعہ دار تھا۔۲۵

جزیہ ٹیکس کو لے کر اورنگ زیب پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہندوؤں کو ذلیل کرنے کے لیے جزیہ لگایا گیا۔ اس پر شبلی کا کہنا ہے کہ یہ الزام اس لیے قائم کیا جاتا ہے کہ لوگ جزیہ کی حقیقت سے واقف نہیں۔ شبلی نے جزیہ کی حقیقت کو جس طرح سمجھایا ہے، اگر اسی طرح آج کے مورخین سمجھ سکتے تو یہ ٹیکس اشتعال انگیز نہ سمجھا جاتا۔ شبلی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> اسلام نے جو انتظام قائم کیا، اس کی رو سے ہر مسلمان خدمت کے لیے مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے ماتحت ہوتے ہیں ان کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی ہے، ان کو فوجی خدمت پر مجبور

۲۵۔ ماخذ سابق، ص ۶۵۔۶۶

کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہیں ہے، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی محافظت کے لیے معاوضہ دیں، اسی معاوضے کا نام جزیہ رکھا گیا، اگر وہ فوج میں شرکت چاہیں تو وہ جزیہ سے بری کر دیے جائیں گے۔[۲۶]

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ مسلم حکومت کی جانب سے غیر مسلموں پر لادے جانے والا بھاری بوجھ نہیں بلکہ ایک معمولی سا ٹیکس ہے جو انہیں فوجی خدمت سے مستثنیٰ کرنے اور جانی و مالی تحفظ فراہم کرنے کے عوض میں ان پر عائد کیا جاتا ہے۔ غیر مسلموں کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ثابت کرنے کے لیے اسلام کے قانون جزیہ کا حوالہ اکثر دیا جاتا ہے اور اسے ان پر ایک زبردست مالی بوجھ اور ذلت کی نشانی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔[۲۷]

شبلی نے جہاں جزیہ کی افادیت بیان کی ہے وہیں انہوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ اورنگ زیب کے ذریعے جزیہ نافذ کرنے سے ہندوؤں کو شکایت ہوئی، جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ محصول ایک مدت سے موقوف ہو چکا تھا، اس کا نئے سرے سے قائم کیا جانا کیوں کر گوارا ہو سکتا تھا؟[۲۸]

مورخین کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ اورنگ زیب نے شیواجی کا شایانِ شان استقبال نہیں کیا۔ اگر دربار میں عزت ملی ہوتی تو بعید نہیں کہ وہ اورنگ زیب کا مطیع و فرماں بردار ہو جاتا۔ شبلی بڑے مورخ ہی نہیں بلکہ ایک اچھے متکلم بھی ہیں، اس لیے ان الزامات کی تردید میں وہ بحیثیت مورخ اپنے قائم کردہ اصول تاریخ سے ہٹ گئے اور اپنے اسلامی جوش کو نہیں چھپا سکے۔ ان کی تحریر سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ ایک غیور مسلمان ہیں جو اس قسم کے اتہامات اور حملوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔

''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں جس موقع پر شبلی نے اس کی تردید کی ہے کہ عالم گیر نے شیواجی کے ساتھ جیسا کہ متعصب مورخین کا خیال ہے، اچھا سلوک نہیں کیا، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اعزاز کو نہایت مناسب طریقے پر قائم رکھا:

شیواجی کی اطاعت کا سلطنت پر کیا احسان تھا؟ شاہی فوجوں نے اس کے تمام علاقے فتح کر لیے تھے۔ وہ قلعے میں چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ اس کے خاص صدر نشین قلعے کے برجوں پر شاہی فوج کا پھریرا اڑ چکا تھا۔

۲۶۔ سید صباح الدین عبد الرحمن، مسلمانوں کی مذہبی رواداری، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۸۹ء، جلد اول، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲۔

۲۷۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام، اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ عہد فیروز شاہی میں، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۹۴۔

۲۸۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، حوالہ مذکورہ، ص ۶۷۔

ان مجبوریوں سے وہ ہتھیار رکھ کر غلاموں کی طرح آیا اور دربار میں روانہ کیا گیا۔ تاہم اس کے استقبال کے لیے اورنگ زیب عالم گیر نے دربار میں سب سے زیادہ جو شخص موزوں ہو سکتا تھا اس کو بھیجا۔ پنج ہزاری امراء کی صف میں، جو خود راجہ جے سنگھ کا منصب تھا، اس کو جگہ دی۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہتا تھا؟ کیا شہنشاہ ہند ایک مفتوح رہزن کے لیے تخت سے اتر آتا؟ بے شبہہ یورپ اس قسم کی جھوٹی اور مکارانہ خوشامدوں کی مثالیں پیش کر سکتا ہے لیکن اسلام سے اس کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔[29]

یہاں شبلی نے اصل واقعہ یعنی شیواجی کے استقبال کا ذکر کرنے کے بعد استنباط نتائج میں اسلام کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

''حواشی مولانا ابوالکلام آزاد'' کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آزاد نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ مولانا آزاد کے حواشی اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ مورخانہ شعور رکھتے تھے اور وہ شبلی کے اورنگ زیب سے متعلق جو نظریات ہیں ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ شیواجی سے متعلق شبلی کی مذکورہ عبارت پر آزاد نے جو حاشیہ لکھا، وہ درج ذیل ہے ”: گویا اعمال عالم گیر اعمال نفس اسلام تھے''۔

شبلی نے اورنگ زیب کے سیاسی عمل کو اسلام سے وابستہ کیا اور آزاد نے اسی پر حاشیہ لکھا۔ اگر شبلی کی عبارت یہاں رک جاتی کہ ''...جو خود راجہ جے سنگھ کا منصب تھا'' تو اسے حقیقت نگاری کے زمرے میں رکھا جاتا لیکن شبلی نے اس کی تشریح کر ڈالی تو مولانا آزاد نے وہیں ان کی گرفت کر لی۔ تاریخ کی روشنی میں واضح ہے کہ عالم گیر کے اعمال سیاسی مصالح سے متعین ہوتے تھے۔ مغل شہنشاہ کو پادشاہ اسلام کی حیثیت سے پیش کرنا مناسب نہیں تھا۔[30]

سنبھا سے متعلق شبلی کی عبارت پر بھی آزاد نے حاشیہ لکھا۔ شبلی کی عبارت اس طرح ہے:

سنبھا عالم گیر کے دربار میں حاضر کیا گیا اور چونکہ اس نے رودر رو عالم گیر کو سخت گالیاں دیں۔ عالم گیر نے اس کی زبان کاٹنے کا حکم دیا، پھر آنکھیں نکلوا کر قتل کر دیا گیا۔ اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ عالم گیر کی پچاس برس کی حکومت کا صرف یہ ایک مستثنیٰ واقعہ ہے ورنہ اس نے کبھی کسی کو اس قسم کی وحشیانہ سزا نہیں دی۔[31]

مولانا آزاد نے اس پر حاشیہ لکھا:

۲۹۔ ماخذ سابق، ص ۲۷۔۲۸۔

۳۰۔ سید جمال الدین، حوالہ مذکورہ۔

۳۱۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۳۸۔

اگرچہ عرق پوست پلا پلا کر زندانیان گوالیار کو ہلاک کرتا رہا، اسلام نے تو ہر حال میں مثلے کو ناجائز بتلایا ہے، لیکن یہ مقدس ولی مغلوب و محکوم دشمن کی زبان کٹواتا ہے اور آنکھیں نکلواتا ہے۔[۳۲]

شبلی نے سنبھا کے ساتھ عالم گیر کے عمل کا دفاع کرنے کی کوشش کی ہے اور مولانا آزاد نے ''مقدس ولی'' کہہ کر شبلی پر نقد کیا ہے، جبکہ بقول سید جمال الدین ایسے بھی کہا جاسکتا تھا کہ ایسے حکمراں کو مقدس ولی تو نہیں کہا جاسکتا۔

داراشکوہ کے سلسلے میں شبلی نے ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں داراشکوہ کی فارسی عبارت کے حوالے سے جو بیان تحریر کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

داراشکوہ کا یہ حال تھا کہ علانیہ ہندوپن کا اظہار کرتا تھا۔ اُپنشد کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں صاف لکھتا ہے کہ قرآن شریف اصل میں اُپنشد میں ہے۔[۳۳]

اس پر آزاد نے حاشیہ لکھا ''اس میں کیا الحاد ہے؟ اگر اپنشد سرچشمۂ بحر توحید بہ قول داراشکوہ ہے اور مطالب قرآن سے متحد تو یقیناً وما انزل من قبلک میں داخل اور قرآن مثل تورات و انجیل اس کا مصداق''، یعنی یہ لکھنا قرآن کے مضامین اپنشد میں موجود ہیں داراشکوہ کو ملحد نہیں قرار دے سکتے۔ یہ تحقیق طلب ہے کہ آخر داراشکوہ کو اس کے معاصرین جن میں شہزادے اور علماء شامل تھے کیوں ملحد تصور کرتے تھے، مثلاً شہزادہ مراد ایک خط میں عالم گیر کو لکھتا ہے ''ملحد (داراشکوہ) نے خط شاہ جہانی میں کمال حاصل کرلیا ہے اور فرامین پر خود دستخط بنادیتا ہے۔''[۳۴] ''کیا اپنشد کا مطالعہ اور ترجمہ کرنا ہندوپن کا اظہار تھا؟'' شبلی کا یہ جملہ یہاں مناسب نہیں لگتا۔ ہندومت کے مطالعے میں داراشکوہ کو دلچسپی تھی اس بنا پر اسے ملحد نہیں کہا جاسکتا البتہ اس کی دیگر سرگرمیوں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اسلام و شریعت کا پابند نہیں تھا، کیونکہ تقابل ادیان کے مطالعہ و تحقیق کا رجحان پہلے بھی تھا اور آج بھی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں رائج ہے۔

اورنگ زیب نے اپنے عہد میں میلوں ٹھیلوں پر پابندی عائد کردی تھی اور محرم کے جلوس کو لے کر برہان پور میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کی وجہ سے تعزیہ کے گشت پر روک لگادی۔ اورنگ زیب کے اس عمل میں مورخین کو مذہبی تعصب نظر آتا ہے۔ یہاں شبلی نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالم گیر کا یہ عمل مذہبی تعصب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس سے نقض امن کا خطرہ تھا۔ اس میں عالم گیر کے مزاج کا دخل بھی

۳۲۔ سید مسیح الحسن (مرتب)، حواشی ابوالکلام آزاد، اردو اکادمی دہلی، مارچ ۱۹۸۸ء، ص ۳۴۸۔

۳۳۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، حوالہ مذکورہ، ص ۶۲۔

۳۴۔ سید جمال الدین، حوالہ مذکورہ۔

ہو سکتا ہے، اس لیے کہ وہ نہایت روکھا پھیکا آدمی تھا، اس کو میلوں ٹھیلوں، ناچ رنگ، گانے بجانے، شراب کباب اور تمام ظاہری نمائش و تکلفات سے نفرت تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ ان چیزوں سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے[۳۵]۔ شبلی کا کہنا ہے کہ اس طرح کے امور میں پابندی پر مذہبی تعصب کا قطعاً دخل نہیں تھا بلکہ انتظامیہ کو چست درست رکھنا اہم مقصد تھا۔

شبلی کے مذکورہ بیان پر مولانا آزاد نے یہ حاشیہ لکھا ''ہندوؤں کے مذہبی میلوں کے بند کرنے کا شرعاً و قانوناً اُس کو کوئی حق نہ تھا، مذہبی اور اخلاقی اصلاح صرف مسلمانوں کے لیے تھی نہ کہ ذمیوں کے لیے''۔[۳۶]

علامہ شبلی نے میلوں ٹھیلوں اور بعض دیگر رسموں پر پابندی کی شرعی حیثیت کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ ان کے خیال میں ''ان چیزوں سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے''، لہٰذا مولانا آزاد کا اعتراض درست نہیں۔ انہوں نے یہ بھی اضافہ کر دیا کہ ''مذہبی اور اخلاقی اصلاح صرف مسلمانوں کے لیے تھی نہ کہ ذمیوں کے لیے''۔ یہ دعویٰ نہ اورنگ زیب نے پیش کیا اور نہ ہی شبلی نے اس دعوے کی پیروی کی۔ مولانا آزاد کے ذہن میں یہ بات آنی چاہیے تھی کہ مسلم حکومت عملاً سب کے لیے تھی اس لیے اخلاقی اصلاح کے اقدامات صرف مسلمانوں کے لیے نہیں اٹھائے جا سکتے تھے، اس میں برادران وطن بھی شامل تھے۔

عالم گیر فن موسیقی کا ماہر تھا لیکن مزامیر کے ساتھ گانا چونکہ شرعاً ممنوع ہے اور دربار شاہی کی شان کے خلاف ہے، اس لئے عالم گیر نے اس صیغہ کو بھی بند کر دیا[۳۷]۔ اس پر مولانا آزاد نے نفی کے ساتھ سوال قائم کیا کہ ''کس شریعت میں ممنوع ہے؟ اسلام میں تو نہیں''۔[۳۸]

اورنگ زیب پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے بہت سے مندر مسمار کیے اور قدیم مندروں کی مرمت اور جدید مندروں کی تعمیر پر پابندی عائد کی۔ علامہ شبلی نے اس الزام کا جائزہ لیا ہے اور تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف انہیں مندروں کو مسمار کیا جہاں حکومت کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں۔ شبلی لکھتے ہیں:

> جس قدر بت خانے توڑے گئے، انہیں مقامات کے توڑے گئے جہاں پُرزور بغاوتیں برپا ہوئیں۔ اورنگ زیب عالم گیر ۲۵ برس تک دکن میں رہا۔ ان ممالک میں ہزاروں بت خانے تھے لیکن کسی تاریخ میں ایک

۳۵۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، حوالہ مذکورہ، ص ۶۷۔

۳۶۔ حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۵۱۔

۳۷۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، ص ۱۱۹۔

۳۸۔ حواشی ابوالکلام آزاد، ص ۳۶۰۔

حرف بھی نہیں مل سکتا کہ اس نے کسی بت خانے کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ الورا کے مشہور مندر میں سینکڑوں تصویریں اور بت ہیں۔ عالم گیر اسی نواح میں میل دو میل کے فاصلے پر مدفون ہے۔ بڑے بڑے بزرگان دین کا یہاں پر مزار ہے، جو عالم گیر سے بہت پہلے گزرے ہیں لیکن یہ بت اور تصویریں آج بھی موجود ہیں۔[۳۹]

عہد اورنگ زیب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب حکومت کے خلاف سازش کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ سازش جہاں بھی ہوتی تھی اسے ختم کرنے اور ان مقامات کو مسمار کرنے میں کسی طرح کی مذہبی جانب داری سے کام نہیں لیتا تھا۔ عہد حاضر کے مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف مندر ہی نہیں توڑا بلکہ گولکنڈہ کی جامع مسجد کو بھی منہدم کرنے کا صرف اس لیے حکم دیا کہ وہاں حکومت کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں۔ یورپین اور ہندو مورخین کہتے ہیں کہ عالم گیر نے بت خانے گرائے اس لیے بغاوت ہوئی، شبلی لکھتے ہیں کہ بغاوت ہوئی اس لیے بت خانے گرائے گئے۔[۴۰]

شبلی کسی مورخ کے بیانات کو من و عن تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ مورخ کی منشاء اور دیگر محرکات کو بھی خوب ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھیں تو علامہ شبلی ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' میں قابل توقیر نظر آتے ہیں۔ شبلی اسباب و علل کے تاریخی فلسفے یا تصور سے بخوبی واقف تھے اور ایک مورخ کی حیثیت سے انہوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ مذہب کو سیاست میں خلط ملط نہ ہونے دیں، نیز عقل و دانش سے عالم گیر اور راجپوتوں کے درمیان تعلقات پر عقلی بحث کریں جس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

شبلی اس کتاب میں ترجمان ملت کی حیثیت سے بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے عالم گیر کو اسلام کا علمبردار تصور کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ عالم گیر تخت پر جلوہ افروز نہ ہوتا تو تیموری سلطنت ہندو بن چکی ہوتی۔ ان کے اس خیال کو ذیل کی عبارت سے تقویت ملتی ہے:

> عالم گیر کو اگرچہ خلافت کا دعویٰ نہ تھا تاہم وہ مسلمان بادشاہ تھا اور اس کا فرض تھا کہ وہ حکومت میں اس قدر اسلامی شان باقی رکھے جس قدر ایک اسلامی حکومت کے لیے اصل عنصر کے لحاظ سے ضروری ہے۔ اکبر نے جس رنگ میں سلطنت کو رنگنا شروع کیا تھا اور جس کی یادگاریں شاہ جہاں کے زمانہ تک باقی تھیں، وہ اگر قائم رہتا تو تیموری سلطنت ایک ہندو سلطنت بن چکی تھی۔ اسلامی شعار بالکل مٹ چکے تھے، عام دربار کا لباس گھیر دار جامہ اور ہندووانی پگڑی تھی۔ راجاؤں کی طرح سلاطین زیور پہنتے تھے۔ دربار میں سلام وغیرہ کے

۳۹۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، حوالہ مذکورہ، ص ۷۳۔

۴۰۔ ماخذ سابق، ص ۷۳۔

بجائے سجدہ یا پائیگی رائج تھی۔ یہ بے غیرتی اس قدر بڑھی کہ بے غیرت مسلمانوں نے ہندوؤں کو لڑکیاں دینی شروع کیں۔ عالم گیر نے عنان سلطنت ہاتھ میں لی تو اس کا یہ فرض تھا کہ اسلامی شعائر دوبارہ قائم کرے۔[41]

شبلی نے اپنی اس کتاب میں اورنگ زیب کا بہت قوت سے دفاع کیا اور معترضین کا جواب دیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی جو تصویر اس کے مخالفوں نے کھینچی ہے اس میں تمام تر تعصب اور عداوت کا رنگ بھرا گیا ہے لیکن یہ کہنا بھی بالکل مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے جو اس میں تھیں ہم تیموری سلاطین کی فہرست میں وہی درجہ اس کو دے سکتے ہیں جو اسے ترتیب شمار کی رو سے حاصل تھا۔ تاہم عام اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی نہیں پیدا ہوا۔[42]

شبلی کی کتاب ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ باوجود اس کوشش کے کہ معروضیت کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، وہ بالکل غیر جانب دار نہیں رہ سکے۔ شبلی کے اسلوب نگارش اور دلیلوں سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اورنگ زیب کی مذہبیت، حکومت کے کاروبار میں مذہبی اصولوں پر عمل اور داراشکوہ کے مذہبی خیالات سے اس کی ناپسندیدگی کی تائید کرتے ہیں۔

ہمایوں نامہ

''ہمایوں نامہ'' کا تعلق بھی تاریخ ہند سے ہے۔ یہ گل بدن بیگم کی تصنیف ہے۔ علامہ شبلی کی نظر جب اس پر پڑی تو انہوں نے اس پر نہایت جامع تبصرہ ''الندوہ'' ۱۹۰۸ء کے ایک شمارے میں کیا۔ گل بدن بیگم کی تاریخی بصیرت اور تاریخی مذاق پر شبلی حیرت زدہ ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> شاہی خاندان کی نازپروردہ خاتون تاریخ نویسی کے فرض اور ذمہ داری سے کس قدر واقف ہے کہ بابر کی وفات کے وقت صرف آٹھ برس کی تھی۔ اس لیے صاف اس نے اس کا اظہار کیا اور یہ بھی تصریح کردی کہ اس عمر کے واقعات کم یاد رہتے ہیں، ساتھ ہی مجبوری بھی ظاہر کی کہ بادشاہ کا حکم تھا، ہمایوں کے واقعات میں بھی جو واقعہ اس کی آنکھوں سے نہیں گزرا اس کے متعلق لکھ دیتی ہے کہ میں نے فلاں شخص سے سنا ہے۔ یہ خاص

۴۱۔ ماخذ سابق، ص ۱۱۸۔

۴۲۔ ماخذ سابق، ص ۱۲۶۔

عرب مورخین کا مذاق ہے کہ روایت کا سلسلہ اخیر تک پہنچا دیتے ہیں۔[۴۳]

شبلی نے کہا ہے کہ گل بدن کا ہمایوں نامہ عام ایشیائی مورخین سے الگ ہے۔ ایشیائی مورخین کی عادت ہے کہ وہ جنگ و جدال، بغاوت اور خوں ریزیوں کے واقعات پر زور صرف کرتے ہیں، ان کی تاریخوں سے اس عہد کے تمدن، سیاست و معاشرت نیز خانگی زندگی کا پتہ لگانا چاہیں تو بہت کم کامیابی ملتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمایوں نامہ کچھ اس انداز میں تحریر ہوا ہے کہ اس میں زیر بحث عہد کی معاشرت اور زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ گل بدن بیگم جب کسی شادی اور جلسے کی تقریب کا حال لکھتی ہے تو من و عن تصویر کھینچ دیتی ہے۔[۴۴]

شبلی نے گل بدن بیگم کے ''ہمایوں نامہ'' پر جو تقریظ لکھی ہے خصوصاً اس عہد کے تمدنی و معاشرتی حالات کے متعلق جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ یقیناً قابل توجہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ عورتیں پڑھنے لکھنے کے علاوہ فنون سپہ گری سے واقف ہوتی تھیں اور سفر و شکار میں گھوڑوں پر سوار ہوتی تھیں، یہاں تک کہ بعض عورتیں مردانہ لباس بھی پہنتی تھیں۔

۲۔ عورتوں کا نہایت احترام کیا جاتا تھا۔

۳۔ ملکی معاملات میں عورتوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

۴۔ عورتوں کو اپنی شادی اور نکاح کے معاملے میں پوری آزادی حاصل تھی۔[۴۵]

شبلی لکھتے ہیں کہ ''ہمارے زمانے کے پردہ شکن گروہ کو یہ سن کر مایوسی ہوگی کہ ان سب باتوں کے ساتھ عورتیں نامحرم سے پردہ کرتی تھیں اور بغیر نقاب اور برقعے کے باہر نہیں نکلتی تھیں''۔[۴۶]

شبلی کے مطابق گل بدن بیگم نے عہد ہمایوں کے ایک ایک واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے اور اس میں وہ دیگر مورخین سے ممتاز نظر آتی ہے۔ شبلی نے ہمایوں نامہ کو اس لیے موضوع بنایا تا کہ اس تاریخی کتاب اور عہد ہمایوں کی سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے نمونے لوگوں کے سامنے آجائیں۔

۴۳۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۵۶ء، ص ۵۹۔

۴۴۔ ماخذ سابق، ص ۵۹۔ ۶۰۔

۴۵۔ ماخذ سابق، ص ۶۲۔

۴۶۔ ماخذ سابق، ص ۶۲۔

مآثر رحیمی

یہ عبدالرحیم خان خاناں سے متعلق عبدالباقی کی کتاب ہے۔ خان خاناں اکبر کا سپہ سالار تھا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں شبلی کلکتہ گئے، وہیں ایشیاٹک سوسائٹی میں انھیں ''مآثر رحیمی'' کا نسخہ ملا۔ اس پر شبلی نے ۱۹۰۸ء میں الندوہ میں ایک مضمون لکھا۔ شبلی کا مقصد ہندوستان کے مسلم حکمرانوں، امرا اور اس عہد کے ترقیاتی کاموں کا تعارف کرانا تھا۔ انہوں نے اس مضمون میں خان خاناں کی ولادت، علمی لیاقت، رفاہ عام کے کام، فن زراعت کی ترقی، کتب خانہ، دربار کے شعرا، علما و اطبا نیز صناعوں اور کاری گروں کے حالات سے متعلق اقتباسات پیش کئے ہیں۔ ان اقتباسات کے ذریعہ شبلی نے قارئین کو جو تاثر دینے کی کوشش کی ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ نایاب، نادر اور کارآمد کتابوں اور ایسے مواد کی تلاش و جستجو میں رہتے تھے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو نمایاں طور پر پیش کیا جاسکے اور اگر اس طرح کی کوئی نادر و نایاب کتاب مل جاتی تو اس کی طباعت و اشاعت پر زور دیتے تھے۔[47]

اس سلسلے میں شبلی نے خلیفہ سید محمد حسین وزیر پٹیالہ، نواب علی حسن خان بھوپال، نواب مزمل اللہ بھیکن پور اور حبیب صادق حبیب الرحمن خان شروانی کی توجہ مبذول کرائی[48]۔ شبلی نے مآثر رحیمی پر جو تبصرہ کیا ہے اس سے ان کے سوانحی نقطۂ نظر کے ساتھ تاریخی فکر کو سمجھا جاسکتا ہے:

> اس کتاب میں خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خان خاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی ہیں، نکتہ چینی کا نام نہیں۔ حالانکہ آج کل کے مذاق کے موافق سوانح عمری اور لائف کی یہ ضروری شرط ہے لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل پُر فریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں، جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کرکے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے اور کوئی عیب اور وہ خفیف کرکے دکھایا جاتا ہے تو اس غرض سے کہ محاسن کے یقین کرانے کا کام آئے یعنی جب عیب نہیں چھپایا ہے تو محاسن کیوں غلط لکھے ہوں گے۔[49]

۴۷۔ ماخذ سابق، ص ۷۰۔

۴۸۔ ماخذ سابق، ص ۷۰۔

۴۹۔ ماخذ سابق، ص ۸۱۔

جہاں گیر اور تزک جہاں گیری

اس مقالہ کی ابتدا شبلی اس طرح کرتے ہیں:

یورپ کے بے درد واقعہ نگاروں نے سلاطین اسلام کی غفلت شعاری، عیش پرستی اور سیاہ کاری کے واقعات اس بلند آہنگی سے تمام عالم میں مشہور کیا ہے کہ خود ہمیں کو یقین آچلا ہے اور تقلید پرست تو بالکل یورپ کے ہم آہنگ بن گئے۔[۵۰]

شبلی نے ''تزک جہاں گیری'' کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی ہے کہ وہ واقعات کا نہایت صحیح اور سچا مرقع ہے، اس میں کسی طرح کی رنگ آمیزی نہیں ہے۔ کتاب کا لکھنے والا حکمت عملی اور سیاسی داؤ پیچ سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ عیب بھی کرتا ہے تو ڈنکے کی چوٹ پر کہہ دیتا ہے اور ہنر کا کوئی کام اس کے ہاتھ سے بن آتا ہے تو داد طلب خاموشی نہیں اختیار کرتا بلکہ علانیہ فخر کا اظہار کرتا ہے۔[۵۱]

حیوانات سے متعلق جہاں گیر کی دلچسپیوں پر شبلی لکھتے ہیں کہ جہاں گیر کے زمانے میں کسی کو اس فن کا خیال بھی نہ ہوگا۔ اس میں حیوانات سے متعلق اس قدر معلومات ملتی ہیں کہ اس علم کی ایک اچھی ابتدائی تصنیف ہو سکتی ہے۔ جہاں گیر جس جانور کو مارتا تھا فوراً اس کا وزن اور تشریح کراتا تھا اور دیکھتا تھا کہ اس میں غیر معمولی کیا کیا چیزیں ہیں۔[۵۲]

شبلی کے مطابق تزک جہاں گیری علم الحیوانات پر کام کرنے والوں کے لیے بہترین ماخذ ہے۔ جہاں گیر جس جانور کی تصویر کشی کرتا ہے، اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ حیوۃ الحیوان جو اس فن کی سب سے عمدہ تصنیف خیال کی جاتی ہے اس میں اکثر یہ نقص پایا جاتا ہے کہ دو جانور جو باہم ملتے جلتے ہیں ان میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ اس بنیاد پر شبلی حیوۃ الحیوان کے مقابلے میں تزک جہاں گیری کو بہتر تصور کرتے ہیں۔

شبلی نے ہمایوں نامہ، مآثر رحیمی اور تزک جہاں گیری کو اس لیے اہمیت دی ہے کہ یہ مغل عہد کی تاریخ کے بنیادی مآخذ ہیں، جن سے سیاسی، معاشی اور ثقافتی زندگی سے متعلق اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

۵۰۔ ماخذ سابق، ص ۸۲۔

۵۱۔ ماخذ سابق، ص ۸۳۔

۵۲۔ مقالات شبلی، جلد پنجم، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص ۱۰۰۔

زیب النساء

انڈین میگزین اینڈ ریویو میں ایک مضمون زیب النساء پر شائع ہوا تھا، جس میں زیب النساء کی شبیہ کو بگاڑنے کی کوشش کی گئی تھی۔ شبلی نے بنیادی مآخذ سے صحیح معلومات یکجا کر کے اس کا جواب لکھا جو ۱۹۰۹ء میں الندوہ میں شائع ہوا۔ اس میں شبلی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انگریز مصنّفین جو غلطیاں کرتے ہیں وہ عام طور پر پھیل جاتی ہیں اور اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے اور اس سے مسلمانوں کے اخلاق اور عادات کی نسبت نہایت برے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں شبلی نے زیب النساء کی ولادت، کمالات علمی، اخلاق و عادات، علم پروری نیز عاقل خاں رازی سے اس کے تعلقات وغیرہ کا مستند کتابوں کی بنیاد پر جائزہ لیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ زیب النساء نے اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ علوم عربیہ اور فارسی زبان دانی میں کمال رکھتی تھی، نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی۔[۵۳] شبلی نے زیب النساء سے عاقل خاں رازی کے تعلقات کی نسبت افواہوں کو بے بنیاد بتایا ہے۔ اس طرح شبلی نے زیب النساء کے بارے میں جو عبارت آرائی کی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مہذب تعلیم یافتہ، اچھی اور دلکش عادات و اطوار کی حامل تھی اور کمالات ظاہری و معنوی میں ممتاز عورت تھی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر

اس مقالے میں شبلی نے یہ واضح کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ایک نعمت تھی۔ ان کی آمد سے یہاں کی تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر پڑا۔ انہوں نے یہاں کی افتادہ زمین کو چمن زار بنا دیا۔ یہ مقالہ درج ذیل تمہید سے شروع ہوتا ہے:

> کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں ورنہ دنیا کے سب سے بڑے فاتح سب سے بڑے مجرم ہوں گے لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر پیدا کیا۔ چنگیز خاں فتوحات کے لحاظ سے دنیا کا فاتح اعظم ہے لیکن اس کی داستان کا ایک ایک حرف خون سے رنگین ہے۔ مرہٹے ایک زمانے میں تمام ہندوستان پر چھا گئے لیکن اس طرح کہ آندھی کی طرح اٹھے، لوٹا مارا، چوتھ وصول کی اور نکل گئے۔ بخلاف اس کے متمدن قوم جب کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو وہاں کی تہذیب و تمدن دفعتہً بدل جاتی ہے۔ سفر کے وسائل، رہنے سہنے کے وسائل، رہنے سہنے کے طور، کھانے پینے کے طریقے، وضع و لباس کا

۵۳۔ ماخذ سابق، ص ۱۰۴۔

انداز، مکانوں کی سجاوٹ، گھروں کی صفائی، تجارت کے سامان، صنعت و حرفت کی حالت ہر چیز پر ایک نیا عالم نظر آتا ہے اور گو مفتوح قوم ضد سے احسان نہ مانے لیکن در و دیوار سے شکر گزاری کی صدائیں آتی ہیں۔[۵۴]

شبلی نے اس مقالے میں مغلوں سے قبل ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا نقشہ تزک بابری کے حوالے سے کھینچنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مغلوں نے کس طرح تہذیب و تمدن کو ترقی دی۔ اس ضمن میں شبلی نے اور چیزوں کے علاوہ یہاں کی زمین، پیداوار اور اس سمت میں مغلوں کی کارکردگی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے:

ہندو چونکہ ملک سے کبھی نکلتے نہ تھے، اس لیے ان کو دنیا کے ثمرات اور مزروعات کی خبر نہ تھی، اس کے سوا ان کی قناعت پسند طبیعت کے لیے بڑہل، کٹہل اور پھوٹ کیا کم تھی۔ تیموریوں نے یہاں آنے کے ساتھ اس طرف توجہ کی اور ایران و خراسان کے لطیف پھول اور پھل لا کر تمام ہندوستان میں پھیلا دیے۔ قلم اور پیوند لگانے سے ہندو مطلقاً واقف نہ تھے۔ سب سے پہلے اکبر کے زمانے میں محمد قلی افشار نے جو کشمیر میں داروغۂ باغات تھا، کابل سے شاہ آلو منگوا کر پیوند لگایا اور پھر عام رواج ہو گیا۔[۵۵]

شبلی نے اس مقالے میں مغلوں کی صنعت و حرفت، بندوبست آراضی، افزائش و ترقی حیوانات، امور رفاہ عام، ایجادات و اختراعات، سامان آتش، فن تعمیر وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ شبلی نے یہ بتایا ہے کہ مغل عہد میں طرح طرح کی چیزیں ایجاد ہوئیں۔ صناعوں نے توپیں بنائیں۔ ان میں سے ایک سترّہ نال کی تھی اور ایک ہی دفع میں سب نالیں سر ہوتی تھیں۔ اس مقالے کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمان بہت سی چیزیں اپنے ساتھ لائے۔ مغلوں نے اپنے حسن مذاق سے یہاں کی تہذیب و معاشرت میں رنگ بھر دیا اور ہندوستان کا رابطہ تہذیب یافتہ قوموں سے استوار ہوا۔ شبلی کے اس مقالے میں ان متعصب مورخین کے جوابات بھی مل سکتے ہیں جنھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کو رحمت کے بجائے زحمت بتایا ہے۔

مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہندو بھائیوں کی ناسپاسی

شبلی کو اس مضمون کے لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بھارت متر (کلکتہ) کے ایڈیٹر نے ملا مسیح کی رامائن پر تبصرہ لکھا اور مسلمانوں سے متعلق درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:

۱۔ مسلمانوں نے صدیوں اس ملک پر حکومت کی اور اس کا خاتمہ بھی ہو گیا مگر اس ملک کے علم و ادب کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ دی۔

۵۴۔ مقالات شبلی، جلد ششم، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹۴۔

۵۵۔ ماخذ سابق، ص ۱۹۷۔

۲۔ اس زمانے میں کوئی ہندوانہ قصہ لکھنا مسلمانوں کے لیے آفت سے کم نہ تھا۔ ہندوؤں کی کوئی بات اپنے قلم سے لکھنے میں مسلمان مصنف کو کافر بننے کا خوف اتنا تنگ کرتا تھا کہ وہ ایک دم گھبرا جاتا تھا۔

۳۔ جہاں گیر کے وقت یہ حالت تھی کہ اگر کوئی مسلمان ہندو کی باتوں کی طرف متوجہ ہو تو اس کو کافر سمجھا جاتا تھا۔

مذکورہ خیالات کا جواب علامہ شبلی نے اپنے اس مقالے میں دیا ہے اور مستند تاریخی ذرائع سے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان علم و فن کے قدر دان تھے۔ علم کی تلاش و جستجو میں رہتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد بھی وہ اپنی قدیم روایات پر قائم رہے۔ شبلی نے مسلمانوں کی روشن خیالی، بے تعصبی اور ہندو علوم کے تئیں ان کی دلچسپی کو بڑے دلچسپ انداز سے تاریخی شواہد کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ انہوں نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے تمدن کو تباہ کر ڈالا، بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں یہاں کی تمدنی و ثقافتی زندگی میں ترقی ہوئی:

> دنیا جانتی ہے کہ ہندو پہلے پتوں پر رکھ کر کھاتے تھے، زمین پر سوتے تھے، بن سلے کپڑے پہنتے تھے، تنگ مکانوں میں بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں نے آکر ان کو کھانے پینے، رہنے سہنے، وضع ولباس، فرش و فروش، زیب وزینت کا سلیقہ سکھایا۔[۵۶]

شبلی ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ دونوں فرقوں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو نفرت انگیز خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ شبلی نے اپنے اس مقالے میں ایسے ''واقعات'' کی تردید کی ہے اور تفصیل سے ان کوششوں کا ذکر کیا ہے جو ہندو مسلم اتحاد کے لیے کی گئی تھیں اور ملا مسیح کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ فارسی شعراء کا کوئی ایسا تذکرہ نہیں جس میں مسیح کے نام اور اس کے حالات نہ ہوں:

> عام خیال یہ ہے کہ بادشاہان ہندوستان میں سب سے پہلے جس نے ہندو پنڈتوں کو دربار میں دخل دیا اور سنسکرت کی کتابوں سے ترجمے کرائے، وہ شہنشاہ اکبر اعظم تھا لیکن یہ ایک سخت تاریخی غلطی ہے۔ اکبر سے سینکڑوں برس پہلے سلطان زین العابدین فرماں روائے کشمیر نے اس علمی صیغہ کی بنیاد ڈالی تھی۔[۵۷]

شبلی نے ''بھارت متر'' کے ایڈیٹر کا بڑا عالمانہ جواب دیا ہے۔ پہلے تو انہوں نے ابو معشر فلکی، ابو ریحان بیرونی، فیضی، غلام علی آزاد اور فیروز شاہ وغیرہ کے کاموں کا ذکر کیا ہے اور پھر یہ کہا کہ ان لوگوں نے جو کچھ کیا اس میں ملکی مصلحت ہوسکتی ہے یا ان کے کارنامے علمی مذاق کے جوش کی طرف منسوب ہو سکتے ہیں

۵۶۔ ماخذ سابق، ص ۱۹۹۔

۵۷۔ ماخذ سابق، ص ۲۲۰۔

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف ہندوؤں کے علوم وفنون کو بلکہ ہندوستان کی سرزمین کو بھی ایسی وقعت کی نگاہ سے دیکھا کہ کسی اجنبی قوم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔[۵۸]

شبلی نے مستند حوالوں سے یہ بتایاہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے کس طرح ہندوؤں کے علوم وفنون کو سیکھا۔ انہوں نے مسلمانوں خصوصاً مغلیہ عہد اور صوبائی سلطنتوں میں ہندوؤں کے علوم وفنون سے متعلق جو کام ہوئے ان کا ذکر کرتے ہوئے فیروز شاہ کے متعلق لکھاہے کہ :

فیروز شاہ تغلق ٹھیٹ مسلمان اور مذہب کا سخت پابند تھا۔ جب کانگڑہ کی تسخیر کے لیے گیااور جوالا مکھی کی سیر کی تووہاں کے کتب خانہ کو بھی دیکھااور وہاں کی بعض نادر کتابوں کا ترجمہ بھی کروایا۔[۵۹]

امیر خسرو نے ہندوستان کے فضائل میں جو کچھ لکھاہے اس کے ذکر کے ساتھ شبلی نے ''بھارت متر'' کے ایڈیٹر کی توجہ ان کاموں کی طرف مبذول کرائی جو خالص ہندوؤں کی تہذیب وثقافت سے متعلق ہیں۔ شبلی نے روایت اور درایت سے ''بھارت متر'' کے ایڈیٹر کے خیالات کی تردید کی۔

شبلی کے تاریخی مقالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بغیر کسی تامل کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ طبعاً مورخ تھے اور اپنی قوم کو تاریخ کا درس دینا چاہتے تھے۔ فن تاریخ کے جو اہم اصول ہیں ان اصولوں کو شبلی نے اپنایا۔ بعض جگہوں پر ایسا لگتا ہے کہ یورپین مصنّفین کے مسلسل جھوٹ سے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں اور جذبات میں یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ایک مورخ ہیں مگر ایسا کم ہی ہوا ہے۔ انہوں نے علم وادب، اخلاق و مذہب، تمدن ومعاشرت سب کو تاریخ کے دائرے میں شامل کیا۔ فن تاریخ سے متعلق ان کے افکار وآرا ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ شبلی نے ادبی ذوق اور طبعی بصیرت سے فکر انسانی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

تاریخ کو واقعات کی کھتونی کے بجائے قومی حافظہ کی بازیافت کا ذریعہ بنایا، قدیم مآخذ سے نئے سوال پوچھے اور اسلامی تاریخ کے ان گوشوں کو منور کردیا جہاں ایک مدت سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔[۶۰]

ہندوستانی تاریخ سے متعلق اورنگ زیب پر شبلی کا کام مورخانہ بصیرت کا حامل ہے۔ انہوں نے زیب النساء اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدنی اثرات کا تجزیہ کیا، اور تحفۃ الہند کو انہوں نے ہی پہلی بار روشناس کرایا جس سے اورنگ زیب کی سنسکرت اور ہندو علوم میں دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلم عہد کی

۵۸۔ ماخذ سابق، ص ۲۲۲۔

۵۹۔ ماخذ سابق، ۲۲۴۔

۶۰۔ معارف، مارچ ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۷۔۱۸۸۔

تاریخ کو غلط فہمیوں کے کہرسے سے نکالنے میں جن مفکرین نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان میں مولانا شبلی کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جائے گا۔

۸، فروری ۱۹۱۰ء کا ایک خط میں، جو مکاتیب شبلی حصہ اول میں شامل ہے، شبلی نواب صدر یار جنگ کو لکھتے ہیں: ''لوگ اکبری یا عالم گیری ہیں لیکن میں جہاں گیری ہوں''۔ اس ایک مختصر جملے میں انہوں نے تاریخ ہند سے متعلق اپنے مسلک کی وضاحت کر دی ہے۔

شبلی نے تاریخ ہند کا جس گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا ہے، موجودہ عہد کے محققین کو اسی اسلوب و معیار کو اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں کے متعلق نام نہاد غیر مسلم مورخین نے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اور ان کے دامن پر ظلم و تعدی کے جو داغ لگائے ہیں یا ان کی عظمت تاریخ کو جس انداز سے بدنما کرنے کی کوشش کی ہے ان کا اسی معیار و انداز پر جواب دیا جاسکے تاکہ بدگمانیوں کا سلسلہ ختم ہو۔

مولانا فراہی کی صاحب دلائل الاعجاز پر تنقید
(جمہرۃ البلاغۃ کی روشنی میں)

قمر اقبال

شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
qamariqballu@gmail.com

بیسوی صدی کے نصف اول میں جن چند ہندوستانی علماء نے عربی واسلامی علوم میں نظریہ سازی کا کام کیا ہے ان میں ایک اہم اور منفرد نام علامہ حمید الدین فراہی کا ہے۔ یوں تو علامہ فراہی کی شناخت قرآنیات کے جید عالم کے طور پر ہے لیکن مولانا کے علمی ورثہ میں ایسی کاوشیں بھی ہیں جو علوم کی دیگر جہات میں راہ نما اصول کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ مولانا فراہی اپنی کتب میں فنی بحثوں کے درمیان دیگر ایسی جہات کی جانب بھی اشارہ کرتے چلے جاتے ہیں جو بظاہر ان کا موضوع گفتگو نہیں ہوتی ہیں۔ اسی لئے مولانا کی تحریروں کو سمجھنا بھی بڑی پتہ ماری کا کام ہو جاتا ہے کیونکہ مولانا ایجاز اپناتے ہوئے مختصر جملوں اور منطقی انداز میں بڑی فلسفیانہ باتیں کہہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا کے رسالہ جمہرۃ البلاغۃ کو رکھا جاسکتا ہے یہ رسالہ اپنی پہلی اشاعت کے مطابق کل ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۳۶۰ھ میں ہوئی تھی جبکہ دوسری اشاعت ۱۴۳۷ھ میں دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڈھ سے ہوئی جس میں صفحات کی کل تعداد ۱۶۷ ہے۔ علامہ شبلی نے اس کتاب کا تفصیلی تعارف کرایا تھا جو ان کے مجموعہ مقالات کے دوسرے حصہ میں شامل ہے، اس مختصر رسالہ میں جہاں ادبی تنقید کے راہ نما اصول ہیں وہیں ادب کی مقصدیت اور اس کی معاشرتی اہمیت پر بھی گفتگو ہے۔ اسلامی ادب کا واضح تصور بھی موجود ہے۔ ارسطو کے ادبی نظریات کا منطقی انداز میں رد ہے تو بعد کے مغربی اور مشرقی ناقدین وادباء مثلاً جان مل، ملٹن، قدامہ بن جعفر پر بھی گفتگو ہے۔

مولانا کا یہ رسالہ اتنا جامع ہے کہ اس کی تشریح کے لئے پورا ایک دفتر درکار ہوگا۔ ادب وبلاغت کے جن نظریات پر انھوں نے گفتگو کی ہے اور جن پر انھوں نے تنقید کی ہے اس کا تقابلی مطالعہ کرنا ایک پورا پروجیکٹ ہے جو نہ تو اس مقالہ کا مقصد ہے اور نہ ہی راقم اس کا اہل ہے۔ آئندہ صفحات میں گفتگو علامہ فراہی کی ان تنقیدوں تک محدود رہے گی جو انھوں نے عربی میں فن بلاغت کے موسس علامہ عبد القاہر الجرجانی کے ادبی نظریات پر کی ہے۔

علامہ عبد القاہر الجرجانی پانچویں صدی ہجری کے متبحر عالم تھے۔ ادبیات کے ضمن میں ان کی دو مشہور کتب اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز ہیں ویسے ان کی دیگر تصانیف بھی ہیں لیکن بلاغت کے ضمن میں عربی کا

کوئی بھی طالب علم ان مذکورہ دو کتابوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا بلکہ یہ دونوں کتابیں بلاغت کے اصول وضوابط کے ضمن میں معیار تصور کی جاتی ہیں۔ مولانا فراہی نے اپنی کتاب جمہرۃ البلاغۃ میں علامہ عبد القاہر الجرجانی کے بعض نظریات کو رد کیا ہے۔ پورے رسالہ میں کل آٹھ جگہوں پر صاحب دلائل الاعجاز یا صاحب اسرار البلاغۃ کہتے ہوئے مولانا نے کہیں پر ہلکی یا کہیں پر شدید تنقید کی ہے۔ مولانا فراہی نے قدماء کے طرز پر ماسوا ایک جگہ کے کہیں بھی حوالہ کا اہتمام نہیں کیا ہے اور جس ایک جگہ عبد القاہر کے قول کو نقل کرتے ہوئے صفحہ کا حوالہ دیا ہے اس میں بھی یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ مولانا کے سامنے کون سا نسخہ تھا۔ جن آٹھ جگہوں پر مولانا نے عبد القاہر الجرجانی کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر تنقید کی ہے ان میں دو جگہوں پر عمومی نوعیت کی تنقید ہے لیکن یہ عمومی تنقید بھی عبد القاہر الجرجانی کے بلاغت کے ضمن میں پورے تصور کے پس منظر کو آشکارا کر دیتی ہے۔ تین مقامات پر تشبیہ کے مسئلہ پر علامہ عبد القاہر الجرجانی کے خیالات کو رد کیا گیا ہے۔ ایک جگہ لفظ و معنی کے ضمن میں تنقید ہے تو دو مقامات پر ترتیب کلام کے ضمن میں جرجانی سے اختلاف ہے۔

اپنی عمومی تنقید کے ضمن میں مولانا فراہی لکھتے ہیں، چونکہ علماء اسلام نے اعجاز قرآن کو منکشف کرنے کی غرض سے فن بلاغت پر گفتگو کی تو وہ اگر کلام عرب کا استقصاء کرتے اور اس میں محاسن تلاش کرتے، ان کی حدود متعین کرتے اور ایک ترتیب میں ان کو منظم کرتے یہاں تک کہ وہ محاسن کلام کی معرفت کے واسطے سے ان کے لئے پیمانہ اور کسوٹی ہو جاتے پھر براعت قرآن اور اس کے معجزاتی نظم پر نگاہ ڈالتے تو وہ معرفت کے زیادہ قریب ہوتے۔ لیکن نہ تو عربوں سے اور نہ ان کے کلام سے انھوں نے استفادہ کیا پس ان کے اوپر عجمیوں کے علوم نے اثر ڈالا، جیسے ان کا مزاج ان سے مل گیا، بجز ان میں سے چند لوگوں کے جیسے جاحظ، وہ عربوں کے اطوار سے ایسے دور نہیں ہوا جیسے صاحب دلائل الاعجاز اور وہ صرف عربوں کے خالص کلام کی قلت ممارست کی وجہ سے دور ہوئے۔ پس اگر یہ چیز ان کو میسر ہوتی تو وہ عربوں کی اس صناعت میں نزاکت جان لیتے اور مولدین پر عربوں کے فضل کا انہیں اعتراف ہوتا[1]۔

مولانا فراہی کی اس تنقید کی دو جہتیں ہیں: ایک تو یہ کہ فن بلاغت کا معیار طے کرنے میں ہمارے قدماء سے اس لئے چوک ہوئی کہ انھوں نے غیر عرب نظریات بلاغت کو قبول کر لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ صاحب دلائل الاعجاز کا خالص عرب ذوق نہیں پیدا ہو سکا تھا۔ واقعاتی طور پر یہ دونوں باتیں درست بھی ہیں۔ تیسری صدی ہجری تک عالم عرب ارسطو کی تحریروں سے آشنا ہو چکا تھا، بلاغت کے حوالے سے ارسطو

۱۔ عبد الحمید الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۳۶۰ھ، ص ۳۔

کی Rhetorica کے تینوں حصوں کا ترجمہ ہو چکا تھا جس نے علماء کو متاثر بھی کیا تھا۔ مولانا فراہی نے جب ادبیات کی تاریخ پر نگاہ ڈالی تو انھیں اندازہ ہوا کہ علماء عرب اپنے اس قیمتی اثاثہ سے کیونکر دور ہو گئے تھے جو ان کی راہ متعین کرنے کے لئے کافی تھا انھیں پتہ چلا کہ یونان سے در آمدہ شدہ فلسفہ ان کو متاثر کرنے لگا تھا۔ بلکہ ارسطو کے نظریات سے عرب علماء متاثر ہونے لگے تھے دوسری جہت تنقید یہ ہے کہ جرجانی جو خالص عربی النسل نہ تھے اگر کلام عرب کو اپنے پیش نظر رکھتے تو جاحظ کی طرح وہ بھی عربوں کے طریقہ اداء سے اور عربوں کے ادبی مزاج سے قریب ہوتے۔ لیکن امر واقعی ہے کہ جرجانی نے مولدین شعراء سے کافی استنباط کیا ہے جو ان کی کتاب دلائل الاعجاز میں بھرا پڑا ہے۔اور مولدین خالص عرب ثقافت سے دور تھے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

اپنی اسی عمومی تنقید کو مزید واضح کرتے ہوئے مولانا ایک دوسری جگہ رقم طراز ہیں، عربوں کا طریقہ نقد کلام صاحب اسرار البلاغۃ کی طرح نہ تھا جو بعد کے لوگوں کے لئے اسوہ بن گئے۔ بعد کے لوگوں نے انھیں کی پیروی کی جبکہ صاحب اسرار البلاغۃ کا طریقہ نقد بعد کے لوگوں اور عربوں کے درمیان اوٹ بن گیا پس اگر وہ کلام عرب سے جڑے رہتے اور ان اصولوں کی جانب توجہ نہ دیتے جو بعد کے لوگوں نے مرتب کیا تھا تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور وہ ذوق کے ذریعہ اعجاز قرآن کی معرفت کے زیادہ قریب ہوتے [۲]۔

یہاں بھی مولانا کا سارا زور اسی پر ہے کہ صاحب دلائل الاعجاز نے بلاغت کے جو اصول متعین کئے ہیں وہ اصل عرب بلاغت سے دور ہیں۔ اصل بلاغت سے مراد وہ اصول وضوابط ہیں جن کی بنیاد پر زمانہ جاہلیت میں شعراء کسی کلام پر فیصلہ صادر کرتے تھے۔ حسن وقبح کا جائزہ لیتے تھے۔تاریخ ادب عربی اور تاریخ نقد پر نگاہ رکھنے والے واقف ہیں کہ اسلام کی آمد سے قبل بھی عربوں کے یہاں تنقید موجود تھی جس کی بنیاد ذوق تھی۔ ذوق کی بنیاد پر پروان چڑھی تنقید کو تاثراتی تنقید کا نام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن تاثراتی تنقید کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں جن ضوابط کے پیش نظر کلام کی تفہیم ہوتی ہے ان میں ذاتیت کے عنصر کے غلبہ کا امکان زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ذوق جن اصولوں کے پیش نظر حسن ذوق میں ڈھلتا ہے اس کے خدو خال بہت واضح نہیں ہوتے۔ ذوق کی آبیاری کا واحد ذریعہ کثرت ممارست ہوتا ہے جس میں فرد کی ذات کا پرتو کبھی مدھم نہیں پڑتا۔ ذاتیت کے اسی عنصر کی وجہ سے فن نقد ان بنیادوں پر استوار نہیں ہو پاتا جو اس کو منطقی علم کا درجہ دلائیں۔ بطور منطقی علم فن بلاغت یہی وجہ ہے کہ بعد میں سامنے آیا جب عوام اور خواص دونوں کا ادبی مذاق بگڑنے لگا تھا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اصول وضوابط کو حاشیہ تحریر میں لایا جائے۔

۲۔ عبدالحمید الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ، معارف پریس اعظم گڈھ، ۱۳۶۰ھ، ص ۴۔

زمانہ جاہلیت کی تنقید صدر اسلام میں ایک دوسرا روپ لے لیتی ہے۔اس کی وجہ معاشرتی اقدار میں اسلام کے ذریعہ لائی گئی تبدیلیاں ہیں۔اسلام چونکہ ایک معاشرتی انقلاب برپا کرتا ہے اس لئے زندگی کا ہر گوشہ کسی نہ کسی طور پر متاثر ہوتا ہے پھر ادب اور تفہیم ادب کے اصول کیوں کر اسی جاہلی ڈگر پر چلتے رہتے۔ انھیں بھی تبدیل ہونا تھا اور وہ تبدیل بھی ہوئے۔صدر اسلام میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں وہ نہ صرف اخلاقی قیود کی پابند تھیں بلکہ انھوں نے عام ادبی مذاق بھی بدل دیا تھا۔اسی تبدیلی کو دیکھ کر اصمعی کو کہنا پڑا کہ صدر اسلام میں شاعری ماند پڑ گئی تھی جبکہ شاعری ماند نہیں پڑی تھی بلکہ شاعروں کے پیمانے بدل گئے تھے۔اصول وضوابط میں تبدیلی کا وہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ان عمومی نوعیت کی بحثوں سے ہٹ کر دیکھیں تو مولانا فراہی نے صاحب اسرار البلاغۃ سے جیسا کہ عرض کیا گیا تین مقامات پر تشبیہ کی ضمن میں اختلاف کیا ہے۔ایک جگہ مولانا فراہی نے علامہ جرجانی کی عبارت نقل کی ہے "کان جل محاسن الکلام ان لم نقل کلها متفرعة عنها (انواع التنشبیه) وراجعة الیها"[۳] (کلام کی اچھائیوں کا زیادہ حصہ اگر ہم پورا نہ کہیں تو تشبیہ سے نکلا ہوا ہے اور اسی کی جانب راجع ہے)۔

مولانا نے عبدالقاہر الجرجانی کی رائے اس تناظر میں نقل کی ہے کہ کیسے ارسطو اور ان کے یہاں مماثلت پائی جاتی ہے چونکہ ارسطو کا خیال تھا کہ شاعروں کا مقصد طمانیت قلب ہے اور اس کے حصول کے لئے شاعر ایک ایسا شعری بیانیہ تخلیق کر سکتا ہے جو واقعاتی صداقت کے پرے ہو تو بعض لوگوں کو گمان ہوا اچھا شعر وہی ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو اور چونکہ عربوں کے اشعار یونانیوں کی طرح رزمیہ نہیں ہے اس لئے تشبیہ میں غلو محاسن شعر میں شمار ہوگا۔

تشبیہ کے ضمن میں مولانا فراہی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ مثالی تشبیہ استعارہ یا مجاز کا مقصد وضاحت ہوتا ہے،اس لئے مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان مغایرت ضروری ہوتی ہے نہیں تو یہ دونوں ایک ہی ہو جائیں گئیں۔مشبہ اور مشبہ بہ میں مغایرت کے قائل علامہ جرجانی بھی ہیں لیکن جرجانی کا مقصد کلام کی خوبصورتی ہے جبکہ مولانا ایضاح کو پیش نظر رکھتے ہیں اسی تشبیہ کے حوالہ[۴] سے ایک اور جگہ مولانا فراہی رقمطراز ہیں "مولدین کو گمان گزرا کہ تشبیہ میں بعد اور ندرت اس کے محاسن میں سے ہے اور جرجانی نے اس کے اثبات میں خوب طوالت سے کام لیا اور خراب تشبیہات کو جمع کر دیا ہے"[۵]۔مذکورہ تینوں مقامات پر تشبیہ کے حوالہ

۳۔عبدالقاہر الجرجانی اسرار البلاغۃ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۹۸۸ء، ص ۲۰۔

۴۔الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ ص ۴۰۔

نوٹ: صاحب اسرار البلاغۃ نے ص ۱۰۹۔۱۱۰ پر اس مسئلے پر گفتگو کی ہے

۵۔الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ ص ۴۷

سے علامہ جرجانی پر مولانا فراہی کی تنقید پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فراہی کے خیال میں تشبیہ اور ندرت تشبیہ کبھی مقصد کلام نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایسی ندرت قابل قبول ہو سکتی ہے جو واقعاتی صداقت کو مسخ کردے۔ دراصل جس زمانہ میں صاحب دلائل الاعجاز نے اپنی مھتم بالشان کتاب ترتیب دی اس زمانہ میں عالم عرب میں ایسا انداز تحریر رواج پاچکا تھا جہاں لفظی بازیگری ادب کی معراج تصور کی جانے لگی تھی۔ عوام کو ایسی تحریریں دلکش لگنے لگی تھی جس میں شاعر یا ادیب لوگوں کی قلبی تسکین کے واسطے حقائق سے پرے ایک خیالی دنیا تعمیر کرتا تھا جس میں وہ نادر تشبیہات سے کام لیتا تھا۔ اگر ادب کی مقصدیت کو پیش نظر رکھا جائے تو ایسا انداز تحریر یقیناً باعث کشش نہ ہوگا۔ مولانا فراہی نے دلالۃ التشبیہ کے عنوان سے ایک علاحدہ باب قائم کرکے تشبیہ کے چار مقاصد بیان کئے ہیں ایضاح، اعجاز، تقریر اور تاثیر۔ مولانا کے تصور تشبیہ کی ان کی اس تحریر سے بھی وضاحت ہوتی ہے "ہم تشبیہ کی اچھائیوں اور اس کی اقسام کے ان کاری نہیں ہیں لیکن ہم اس کو تشبیہ کے علاوہ اور کسی اصل سے نکلا ہوا مانتے ہیں اور اس کی اساس صدق ہے۔[6] ایک اور جگہ مولانا لکھتے ہیں "تشبیہ کا حسن سچائی اور مطابقت میں ہے"۔[7]

مولانا فراہی اور علامہ جرجانی کے نظریہ تشبیہ میں تفاوت کی وجہ اب بالکل واضح ہوگئی ہوگی کہ مولانا تشبیہ کو مقصد کلام نہیں سمجھتے اور نہ ہی ایسی تشبیہات کو روا رکھتے ہیں جس سے واقعہ کی صداقت پر آنچ آتی ہو جبکہ علامہ جرجانی کلام کو صرف پر کشش بنانے کی غرض سے تشبیہ کی تعریف کرتے ہیں۔ علامہ جرجانی کے یہاں کلام کا مقصد حظ ہے جو تشبیہات سے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ مولانا فراہی کے یہاں کلام کا مقصد حظ نہ ہوکر سامع کو باخبر کرنا ہے۔ جب مقصد ہی میں اختلاف ہے تو وسیلہ میں اختلاف یقینی ہوگا۔ اسی لئے مولانا فراہی ایسی تشبیہات کو روا نہیں رکھتے جو ان کے مقصد کلام کے تصور سے متعارض ہوں۔ تشبیہ کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ جس کی وجہ سے مولانا فراہی علامہ جرجانی کا رد کرتے ہیں وہ لفظ و معنی کا مسئلہ ہے مولانا ایک جگہ رقمطراز ہیں: " والعجب كل العجب كيف غلب الهم على صاحب دلائل الاعجاز فزعم ان المتكلم لا يعنيه* إلا المعنى ولا هم له فى الالفاظ من جهة جواهرها"۔[8] صاحب دلائل الاعجاز نے لفظ و معنی کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے یہ رائے پیش کی ہے کہ لفظ کی اہمیت نہیں بلکہ معنی ہی اصل اہمیت کا حامل ہے[9]۔

۶۔ الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ ص ۷

۷۔ الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ ص ۳۹

* اصل میں " لا یعینہ" لکھا ہے جو تصحیف ہے یا پروف ریڈنگ کی غلطی (مدیر)

۸۔ الفراہی، جمہرۃ البلاغۃ ص ۳۱

۹۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: عبدالقاہر الجرجانی، دلائل الاعجاز، مکتبہ الخانجی، القاہرۃ، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۸۹ء ص

مولانا فراہی اس ضمن میں علامہ جرجانی کے ہم خیال نہ ہو کر ان کے برعکس ایک معتدل رائے پیش کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ اصحاب بلاغت کے یہاں چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں بھی باعث نزاع رہا ہے۔ معتزلہ جہاں لفظ کو اہمیت دیتے تھے وہیں اشاعرہ نے معنی کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ عبدالقاہر الجرجانی اشعری تھے اور انھوں نے بڑی مضبوطی سے معتزلہ کی رائے کو رد کیا ہے۔ عصر حاضر کے ایک ممتاز اسکالر کے لفظوں میں پوری کتاب دلائل الاعجاز صرف دو اقوال کے ارد گرد گھوم رہی ہے: "ان المعانی لا تتزاید وانما تتزاید الألفاظ یا پھر الفصاحۃ لاتظھر فی إفراد الکلمات ولکن بالضم علی طریقۃ مخصوصۃ" [۱۰]۔ محمود شاکر کے مطابق یہ دونوں جملے قاضی عبدالجبار مشہور معتزلی عالم کی کتاب المغنی سے ماخوذ ہیں۔ قاضی جبار کے انھیں اقوال کے رد میں عبدالقاہر الجرجانی نے دلائل الاعجاز کی پوری عمارت تعمیر کی ہے۔

مولانا فراہی کا نظریہ اس ضمن میں جیسا کہ عرض کیا گیا اعتدال کا حامل ہے۔ ان کے خیال میں صوتی معنوی اشتقاقی اعتبار سے ہم آہنگ الفاظ کے استعمال سے ہی بلاغت کا مقصود حاصل ہو سکتا ہے [۱۱]۔ مولانا فراہی اپنی رائے کے اثبات کی غرض سے متعدد ابواب قائم کرتے ہیں اور مدلل طریقے سے اپنی بات کو ثابت کرتے ہیں جس کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ اچھا کلام وہی ہو سکتا ہے کہ جس میں لفظ و معنی میں ایک قسم کی ہم آہنگی ہو۔ نہ صرف اچھے معنی کے انتخاب سے بلکہ اچھے معنی کو اچھے اور مناسب الفاظ کے ذریعہ برت کر ہی کلام کو بلیغ بنایا جا سکتا ہے۔ لفظ و معنی کے ضمن میں یہ اعتدال مولانا فراہی کے یہاں اس وجہ سے آیا کہ مولانا ایسے معانی و مفاہیم کی قطعاً اجازت نہیں دیتے جو سچائی یا اخلاقی اصولوں سے عاری ہو۔ اگر کوئی کلام خواہ وہ کتنا ہی پر اثر ہو اگر سچائی کے وصف کا حامل نہیں ہے تو وہ قابل قدر نہ ہوگا۔ سچے طور پر بلیغ کلام وہی ہوگا جو سچائی کا بھی حامل ہو اور ساتھ میں پر اثر طریقے سے مناسب الفاظ کے ذریعہ اس سچائی کا اظہار کیا گیا ہو۔

صاحب دلائل الاعجاز پر محمود شاکر نے بھی زبردست تنقید کی ہے۔ محمود شاکر کے مطابق دلائل الاعجاز میں سارا زور فصاحت کے ضمن میں قاضی عبدالجبار کی گفتگو رد کرنے اور لفظ کے مسئلہ میں ان کے اقوال کے فساد کو ظاہر کرنے میں ہے جو ان کی کتاب المغنی میں محدود و وقتی معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ لفظ کے مطلق معنی میں اس حیثیت سے کہ وہ لفظ ہے اور کسی زبان سے ادا ہوا ہے۔ اس تعلق سے صرف نظر لفظ و معنی کے مفہوم کو سمجھنے میں عبدالقاہر الجرجانی کو ایک فحش غلطی کی جانب لے گیا ہے۔ نہ تو عبدالقاہر لفظ کی

۲۵۶-۲۵۷۔

۱۰۔ دلائل الاعجاز۔ مقدمہ، ص: ب۔

۱۱۔ تفصیل جمہرۃ ص ۳۱۔

حقیقت کو سمجھ پائے اور نہ ہی معنی کی"[12]۔

لفظ و معنی پر اس مختصر گفتگو کے بعد دو اور مقامات کا تذکرہ ضروری ہو جاتا ہے جہاں مولانا فراہی صاحب دلائل الاعجاز سے اختلاف کرتے ہیں یہ دونوں مقامات دراصل ایک ہی موضوع کے ضمن میں ہیں۔ اور وہ موضوع ہے ترتیب کلام کا۔ مولانا حسن ترتیب کے قائل ہیں جسکے بغیر کسی تصویر کا مکمل ہونا محال ہوتا ہے مولانا ترتیب کو کلام کی روح قرار دیتے ہیں۔ صاحب دلائل الاعجاز نے المرقش کا ایک شعر نقل کیا ہے وہ شعر یہ ہے:

النشر مسك والوجوه دنا نير واطراف الاكف عنم[13]

علامہ عبدالقاہر الجرجانی کو اس شعر میں کوئی ترتیب نظر نہیں آئی ہے"[14]۔ لیکن مولانا فراہی کا اصرار ہے کہ اس میں بڑی خوبصورت ترتیب ہے اور جو ترتیب انھوں نے بیان کی ہے اس سے شعر کے معنوی حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مولانا کے مطابق شاعر نے پہلے خوشبو پھیلنے کا تذکرہ کیا ہے کہ اس کے لئے سامنے ہونا ضروری نہیں پھر چہروں کی خوبصورتی کا تذکرہ ہے جو مشاہدے پر سامنے آتی ہے پھر جب قربت ہو اور ہتھیلیوں کے لمس کا موقع ملے تو ان کی نزاکت کا احساس ہوتا ہے۔"[15]

اسی ترتیب کے ضمن میں مولانا فراہی جرجانی کے جاحظ کے کلام کے ضمن میں یہ کہنے پر کہ یہ کلام اچھا تو ہے لیکن اس میں ترتیب نہیں ہے، تنقید کرتے ہیں۔ مولانا کے خیال میں جاحظ جیسا ماہر فن ترتیب کا دامن کیسے چھوڑ سکتا ہے پھر انھوں نے جاحظ کے کلام کو نقل کر کے اس میں حسن ترتیب کی عملی توضیح پیش کی ہے"[16]۔

ترتیب کے ضمن میں مولانا کا یہ علمی ثبوت اس عبارت کے معنوی حسن میں اضافہ پیدا کر دیتا ہے جو عبارت عبدالقاہر جرجانی کے مطابق بے ربط تھی اس میں ربط دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ترتیب بلاغت کا ایک اہم جزء ہے۔

۱۲۔ دلائل الاعجاز، مقدمہ ص ھ۔

۱۳۔ ڈاکٹر اورنگزیب اعظمی (شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے ہمارے استفسار پر وضاحت کی کہ یہ شعر المرقش الأکبر کا ہے (دیوان المرقشین، تحقیق: کارین صادر، دار صادر، بیروت، ط ۱، ۱۹۹۸م، ص ۶۸) مگر یہ روایت لسان العرب (نشر) کی ہے جبکہ دیوان میں "اطراف الاکف" کے بجائے "أطراف البنان" لکھا ہے۔ "عنم" ایک پودا ہے جسکا پھول اور پھل سرخ ہوتا ہے۔ قدیم عرب مہندی لگی انگلیوں کے پور کو اس سے تشبیہ دیتے تھے۔ ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی نے ہمارے استفسار پر وضاحت کی کہ شعر ٹھیک نقل ہوا ہے اور وہ اسی طرح معروف شعری مجموعے مفضلیات میں شامل ہے (مدیر)۔

۱۴۔ دلائل الاعجاز ص ۵۳۵ نیز جمہرۃ ص ۵۱۔

۱۵۔ جمہرۃ ص ۵۱۔

۱۶۔ جمہرۃ ص ۵۱۔

مولانا فراہی کی صاحب دلائل الاعجاز پر تنقید کے اس مختصر بیان سے یہ تو واضح ہو گیا کہ مولانا فراہی بلاغت کے اس تشریح سے قطعاً متفق نہیں ہیں جو عبد القاہر الجرجانی نے پیش کی تھی۔ اگر دیکھا جائے تو صرف دو اسباب ایسے ہیں جس کی وجہ سے مولانا فراہی عبد القاہر الجرجانی کے تصور بلاغت کو رد کرتے ہیں۔ ایک تو صدق کا واقعاتی تصور دوسرے ترتیب کلام جس سے معنوی حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ترتیب کلام کا مولانا فراہی کا یہ تصور بڑا جامع اور معنی آفرین ہے۔ جہاں تک صدق کا مسئلہ ہے تو مولانا چونکہ بلاغت کو بھی کلام ربانی کی روشنی میں دیکھتے ہیں جیسا کہ انھوں نے قل لهم قولا بليغا ولله الحجة البالغة سے استدلال کیا ہے اس لئے واقعاتی صداقت سے ہلکا سا اجتناب بھی ان کو برداشت نہیں ہے اور ہو بھی کیوں۔ کلام الٰہی پر مکمل ایمان اس کا متقاضی ہے۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ مولانا جس کلام عرب کا تذکرہ بار بار کرتے ہیں اور عربوں کا جو ذوق ان کے یہاں میزان نقد ہے اس میں کذب کی یک گونہ آمیزش موجود ہے تو پھر یہ کلام عرب کیونکر بلاغت کے معیار کا تعین کر سکتا ہے اور مولانا فراہی جس واقعاتی صداقت پر زور دیتے ہیں وہ اس کذب کی وجہ سے ماند پڑ جاتی ہے۔ اس سوال کا احساس مولانا فراہی کو بھی تھا چنانچہ اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے۔ مولانا کے مطابق شعر میں جو کذب پایا جاتا ہے وہ صرف تمثیل کی صحت اور سچائی کی غرض سے ہوتا ہے۔ اپنی اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ تشبیہ اور غیر تشبیہ میں جو کذب مبالغہ ہوتا ہے اس سے شاعر صرف اپنے نفس کی خبر بتاتا ہے بلکہ خبر اس کا مقصد ہی نہیں ہوتا...... اگر کذب مبالغہ اس حد کو پار نہ کرنے یعنی احساس نفس کو تو یہ عین صدق ہے۔ جس کو اس کا علم نہ ہوا تو وہ احساس اور افتراء کے درمیان فرق نہ کر سکا اور اس نے کذب کو شعر کا جزء سمجھ لیا جب کہ شعر کی بنیاد صرف صدق پر ہے[۱۷]۔

مولانا کے احساس نفس کی قید پر غور کیا جائے تو اس میں انفرادیت اور ذاتیت کا ایسا تصور پیدا ہوتا ہے جو کسی جامع اصول کا پابند نہیں ہو سکتا ہے ہر شخص کا اپنا نفس اور اس کا احساس ہو سکتا ہے اور اس کے اپنے میزانیے بھی ہو سکتے ہیں جو بلاغت یا کذب مبالغہ کی الگ الگ حدود بنا سکتے ہیں۔ اس میں پریشانی یہ پیدا ہوتی ہے کہ واقعاتی صدق کی طرح احساس کی کوئی غیر تبدل پذیر شکل نہیں ہو سکتی۔ احساس کوئی جامد شئے نہ ہو کر مختلف قوتوں کے تابع ہوتا ہے اس طرح ہم کذب مبالغہ کا کوئی بھی معیار قائم نہیں کر سکتے نتیجہ کے طور پر ہم بلاغت کے بہت واضح اصول وضوابط طے کرنے سے قاصر ہوں گے۔ مولانا فراہی چونکہ کلام عرب کو پسند کرتے تھے اور ایک حد تک اس میں کذب مبالغہ بھی ہے اس لئے ایسی توضیح کی ان کو ضرورت محسوس ہوئی۔

۱۷۔ جمہرۃ ص ۱۳۔

مولانا فراہی کی مذکورہ بات کے ضمن میں اگر کلام عرب پر غور کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کا شاعر واقعاتی صداقت سے انحراف نہیں کرتا۔ اس کا شعر سچی بنیاد پر سچائی کی خبر دیتا ہے ہاں اپنی بات کو پر اثر بنانے کے لئے شاعر بلاغت کے اصول اپناتا ہے جس میں کذب مبالغہ بھی ایک حد تک ہوتا ہے لیکن یہ کذب مبالغہ واقعاتی تصویر کو مسخ نہیں کرتا ہے گویا مولانا فراہی کا جو تصور بلاغت ہے جس میں واقعاتی صداقت اولین شرط ہے۔ کلام عرب اس پر پورا اترتا ہے۔ مولانا فراہی کے اس تصور بلاغت کی جڑیں افلاطون کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ افلاطون کے مطابق بلاغت کا موضوع سچائی ہے اور اس کا ہدف براہ عقل، دلیل اور گفتگو مطلق مثالی حقیقت کا اظہار ہے گویا افلاطون یہ کہنا چاہتا ہے کہ صدق اور مثالی حقیقت ہی کلام بلیغ کا معیار طے کر سکتا ہے۔ اگر یہ عنصر کم ہوا تو کلام کی بلاغت میں کمی واقع ہو جائے گی۔ جبکہ افلاطون کا شاگرد ارسطو بلاغت کا مقصد تاثیر اور اقناع کو سمجھتا ہے۔ کوئی کلام اگر سامع یا قاری کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے یا کسی قسم کا داعیہ پیدا کرتا ہے چاہے رنج ہو یا خوشی تو وہ کلام بلیغ تصور ہوگا۔ ارسطو کے اس تصور بلاغت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ارسطو اخلاق یا صدق سے عاری کلام کو بھی بلیغ کہتا ہے، اگر اس میں سامع یا قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہو[۱۸]۔ اس بیانیہ کو مان لینے کا مطلب ہوگا کہ ہم واقعاتی کذب کو روا رکھتے ہیں جو یقیناً بلاغت کے اس تصور سے متعارض ہوگا جس کی وضاحت مولانا فراہی کلام الٰہی کی روشنی میں کرتے ہیں۔ تاہم یہ اشکال اپنی جگہ باقی رہے گا کہ ہم ادب و بلاغت کے مولانا فراہی کے نظریہ کی تطبیق کے بعد اس ادبی اثاثے کا کیا کریں گے جو عربی یا دنیا کی دیگر زبانوں میں موجود ہے۔ دراصل ناقدین ادب آج تک ایسا کوئی اصول وضع نہیں کر پائے ہیں جو دونوں نظریات یعنی واقعاتی صداقت اور شعری ادبی صداقت کے درمیان تطابق پیدا کر سکے۔

۱۸۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: د جمیل الحمداوی، من البلاغۃ الکلاسیکیۃ الی البلاغۃ الجدیدۃ، المثقف۔ ڈاٹ کام، شمارہ ۹۹۳ مئی ۲۰۰۹ء۔

جنوب کے صاحب دیوان فارسی شاعر

علامہ اخترؔ کڈپوی

ڈاکٹر راہی فدائی

9448166536

ہندوستان میں فارسی کی روایت ایک ہزار سال پرانی ہے۔اس کے آغاز کی تاریخ سلطان محمودؔ غزنوی (متوفی ۴۲۱ھ/۱۰۳۰ء) کی ہند آمد (۴۱۲ھ/۱۰۲۱ء)اور سندھ، ملتان، پنجاب، میرٹھ اور نواح دہلی کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد رقم کی گئی۔ ہندوستان کی شمالی ریاستوں پر آل محمود کی حکومت تقریباً ڈیڑھ سو سال تک رہی۔ اس دوران کئی نامور فارسی شعرا اپنے تخلیقی کارناموں کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے،ان میں مسعود سعدؔ سلمان لاہوری(۴۳۸ھ۔۵۱۵ھ)، سلطان بہرام بن مسعود غزنوی (متوفی ۵۴۷ھ)کے درباری شاعر ابوسعید سعادت بن مسعود سعد، مختار غزنوی (متوفی ۵۶۶ھ یا ۵۶۹ھ)، شہاب الدولہ والدین محمد بن رشید الرئیس (متوفی ۵۹۸ھ) کی شہرتیں بامِ عروج کو چھو رہی تھیں[1]۔

شمالی ہند کے مقابلے میں جنوب میں فارسی زبان وادب کی ابتدا قدرے تاخیر سے ہوئی، ساتویں صدی ہجری میں سلطنت دہلیؔ کا تاجدار سلطان علاء الدین خلجی (عہد حکومت ۶۹۴ھ/۱۲۹۵ء تا ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) شمالی ہند کی فتوحات سے فارغ ہوکر مہاراشٹر کے یادو خاندان کی راجدھانی ''دیو گری'' پر حملہ آور ہوا تو وہاں اسے بے شمار دولت ہاتھ آئی، اسے اندازہ ہو گیا کہ جنوبی ہند میں زر و جواہر کے خزانے موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے قابل اعتماد سپہ سالار ''ملک کافور'' (مقتول ۷۱۶ھ) کو ''دیو گری'' فتح کرنے کے لئے ۷۰۶ھ/۱۳۰۶ء میں روانہ کیا، ملکؔ کافور نے اس مہم میں کامیابی کے بعد پہلے ورنگلؔ (آندھرا) کو فتح کیا، بعدازاں اس نے ۷۰۹ھ میں ''ہوے سلا'' سلطنت کے پایہ تخت ''دوار سمودر'' کو بھی دہلی کا باج گزار بنادیا۔اس نے اپنی کامیابیوں کو جاری رکھتے ہوئے ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں جنوب کے آخری سرے پر واقع شہر مدوراؔ اور رامیشورمؔ کو بھی دہلی کے قلم رو میں شامل کر دیا۔یہی وہ دور تھا جب ان فاتح حکمرانوں کے ساتھ ان کی زبان فارسی بھی جنوب میں داخل ہوگئی، خلجیوں کی تیس سالہ مستحکم

۱۔ راہی فدائی، تذکرۂ محدثین جنوب اور دیگر مضامین، الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد، مطبوعہ ۲۰۲۰ء ص: ۱۹۳۔۲۰۰

حکومت کے بعد انہی کے ایک تُرک صوبہ دار سلطان غیاث الدین تغلق نے ۷۲۱ھ میں زمام حکومت سنبھالی، غیاث الدین کے بعد اس کے لائق وفائق فرزند سلطان محمد بن تغلق (عہد ۷۲۵ھ/۱۳۲۵ء تا ۷۵۹ھ/۱۳۵۱ء) نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کی نگہداشت کی غرض سے دہلی کے بجائے جنوب میں واقع ''دولت آباد'' (نزد اورنگ آباد) کو اپنا دارالخلافہ بنالیا، جس سے نہ صرف اس علاقے میں بلکہ جنوب کے دور دراز علاقوں میں بھی حکومت کی سرکاری زبان فارسی رائج ہوگئی، پھر ملک کافور کے دکن میں داخلے کے تقریباً چالیس سال بعد سیاسی عوامل کے تحت ۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء میں دکن کی عظیم الشان خود مختار بہمنی سلطنت سلطان علاء الدین بہمن شاہ (متوفی ۷۵۹ھ) نے قائم کی جو تقریباً ڈیڑھ سو سال تک بڑے تزک واحتشام کے ساتھ جاری رہی، اس دور میں فارسی زبان وادب کو خوب فروغ حاصل ہوا اور وہ بام عروج تک پہنچ گئی۔ اس دور کے مشہور ومعروف شعرا وادبا میں سلطان محمود شاہ بہمنی (متوفی ۷۹۹ھ/۱۳۹۷ء)، میر فضل اللہ انجو (متوفی ۸۲۰ھ/۱۴۱۷ء)، سلطان فیروز شاہ بہمنی (متوفی ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۲ء) حضرت سید محمد گیسودراز (متوفی ۸۲۵ھ) خواجہ عمادالدین محمود گاواں شہید (شہادت ۸۸۶ھ/۱۴۸۱ء) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جنوب کا ایک اہم تاریخی شہر کڈپہ جس پر طویل عرصے تک مختلف نوابوں کی حکمرانی رہی، اپنے ادبی مزاج کے لئے کافی مشہور ہے، کڈپہ میں فارسی زبان کا رواج کب سے ہے؟ اس کا قطعی ثبوت تاحال مہیا نہیں ہوسکا مگر اتنی بات تو ضرور کہی جاسکتی ہے کہ بہمنی سلاطین کے دور (۷۴۸ھ تا ۷۹۹ھ/۱۳۴۷ء تا ۱۳۹۷ء) میں اور بعد ازاں عادل شاہی عہد (۸۹۶ھ تا ۱۱۰۱ھ-۱۴۹۰ء تا ۱۶۸۹ء) اور قطب شاہی زمانۂ حکومت (۹۲۴ھ تا ۱۱۰۰ھ ۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء) میں بھی کڈپہ ان سلاطین کے قلمرو میں داخل تھا، یہ عین ممکن ہے کہ فارسی کے ابتدائی نقوش آٹھویں صدی ہجری میں پائے جاتے ہوں، علاوہ ازیں سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ تا ۱۰۵۷ھ/۱۶۲۵ء تا ۱۶۴۷ء) کے مشہور سپہ سالار محمد سعید میر جملہ نے ۱۰۵۶ھ/۱۶۴۵ء میں کڈپہ اور سدھوٹ کو فتح کیا تھا، اس وقت کڈپہ میں فاتحین کی زبان فارسی باقاعدہ طور پر رائج ہوگئی تھی، میر جملہ کے بعد قطب شاہی سلطنت کے ایک اور نامور سپہ سالار نیک نام خاں (متوفی ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء) نے کڈپہ کو مرکز بناکر تمام ''رائل سیما'' پر حکومت کی[۲]۔ نیک نام خاں اسم با مسمّٰی تھا وہ بڑا سخی وفیاض اور بلند کردار حکمران تھا، اسی لئے اس کے نام کی مناسبت سے شہر کڈپہ کا نام ''نیک نام آباد'' رکھا گیا، نیک نام خاں کے دور میں فارسی زبان وادب کی بھرپور نشوونما ہوئی، اس نیک اور قابل حکمران کے بعد اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۷۰۶ء) کی جانب سے ایک بہادر افغان سپہ سالار میانہ عبدالنبی خاں ابن میانہ عبدالرحیم خاں کو کڈپہ

۲۔ راہی فدائی، کڈپہ میں اردو، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۲ء (دوسرا ایڈیشن) ص: ۲۰

علاقے کی حکمرانی سونپی گئی، نواب عبدالنبی خاں میانہ نے اپنے دور حکومت (۱۱۱۴ھ تا ۱۱۵۸ھ۔۱۷۰۲ء تا ۱۷۴۵ء)[۳] میں اس وقت کی رائج زبان دکنی کے ساتھ فارسی پر بھی خاص توجہ مبذول کی، جس کی وجہ سے فارسی ادبیات کی ترقی وترویج کی راہیں ہموار ہوگئیں، اس دور میں نواب عبدالنبی خاں میانہ کے درباری شاعر محمد بن رضا، مشہور فارسی شاعر تھے جنھوں نے شیخ الاسلام شرف الدین محمد بن سعید بوصیریؒ (متوفی ۶۹۴ھ) کے معرکہ آرا قصیدہ معروف بہ قصیدۂ بردہ کا سب سے پہلے دکنی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ نواب مذکور کے تیسرے فرزند نواب عبدالحمید خاں میانہ (۱۱۵۹ھ تا ۱۱۶۱ھ۔۱۷۴۶ء تا ۱۷۴۸ء) کے درباری شاعر محمد حیدر ابن جعفر بھی فارسی کے عمدہ شاعر تھے، انہوں نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے ملک الشعرا ابنِ نشاطی (متوفی ۱۰۶۶ھ) کی مشہور ومعروف مثنوی ''پھول بن'' (دکنی) میں بطور تکملہ تین سو اکتالیس (۳۴۱) اشعار کا اضافہ کیا تھا[۴]۔ بارہویں صدی ہجری کے ممتاز قلمکاروں میں عالم ربّانی صوفی صافی حضرت سید شاہ جمال بخاری (متوفی ۱۱۶۲ھ) ابن حضرت سید شاہ کمال الدین بخاری (اول) اور شاہ جمال بخاری کے فرزند حضرت سید شاہ محمد حسینی بخاری ملقب بہ شاہمیر (متوفی ۱۱۸۶ھ) مصنف ''ضیاء العیون'' اور ان کے منجھلے بھائی حضرت سید شاہ نوراللہ بادشاہ قادری بخاری (متوفی ۱۲۱۴ھ) مصنف ''تجلیات نورانی'' (فارسی) اور شاہ نوراللہ کے چھوٹے بھائی حضرت سید شاہ کمال الدین بخاری قادری ملقب بہ ''جامئ دکن'' (متوفی ۱۲۲۴ھ) مصنف کلمات کمالیہ (فارسی) اور جامئ دکن کے معاصر وصدیق صادق حضرت علامہ شاہ ذوالفقار علی خاں سوریازائی اختر کڈپوی شامل ہیں۔

علامہ اختر کا اسم گرامی ذوالفقار علی خاں معروف بہ محمود خاں ابن گلاب خاں ہے، افغان پٹھانوں کے مشہور قبیلہ ''سوریازائی'' کے چشم وچراغ تھے، اس بات کا ذکر انہوں نے اپنے دیوان میں شامل نظم بعنوان ''در حسبِ حال'' میں کیا ہے۔ اشعار یہ ہیں:

''چو اختر نہ شد در جہاں درد مند — بزنجیر زُلفِ بتاں پائ بند
دِلی داشت از خنجر درد ریش — ز غم آتش افگند در جانِ خویش
ز سوزِ جنوں سینہ اش داغ داغ — فروزد از ان داغ روشن چراغ
بود ذوالفقارِ علی خان بنام — ملقّب بہ محمود خان در عوام
ابویش مسمّی بخانِ گلاب — کہ اخلاق او بود جان گلاب

۳۔ ماخذ سابق، ص: ۳۹۔ بحوالہ ''لارڈ میکنزے رکارڈز''

۴۔ ماخذ سابق، س: ۳۲۔ ۴۲۔ میانہ خاندان کے حکمرانوں کا نسبی تعلق بقول محمود خاں محمود، بنگلوری، صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے (صحیفۂ ٹیپو سلطان حصۂ دوم، مطبوعہ گوشۂ ادب، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص: ۲۷۷)

ز افغاں بود سوریازی نسب بقا کمتر ایں قوم دارد عجب
ولے از کرم ایزدِ کار ساز کند عمر فرزند او را دراز
ز علم و عمل بہرۂ بخشدش چو مردان خود زہرۂ بخشدش'' [۵]

یہ سنہ ۱۲۲۸ھ کی ہے:

ہزار و دو صد بیست بالائے ہشت
ز ہجرت کہ ایں نعز نامہ نوشت

علامہ اخترؔ نابغۂ علم و ادب تھے، آپ نے علوم ظاہری اور سلوک باطنی کی تعلیم خانوادۂ شمیریہ کے معلم و مرشد علامۂ زماں، عارف باللہ حضرت سید شاہ محمد حسینی ملقب بہ شمیر اول (متوفی ۱۱۸۶ھ) کے فرزند کلاں حضرت سید شاہ محی الدین باشا بخاری قادری (متوفی ۱۲۴۵ھ) سے حاصل کی۔ شیخ موصوف نے ان کو اپنی اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ علامہ اختر نے اپنے دیوان میں پیر و مرشد کی مدح و ثنا میں قصیدہ لکھا، جس کے عنوان ہی سے شیخ کے ساتھ ان کی انتہائی عقیدت و کمال محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ عنوان اس طرح ہے ''قصیدہ در مدح و ثنائے مرشد خود اکمل العارفین زبدۃ الواصلین سید السالکین سلطان العاشقین حضرت سید شاہ محی الدین قدس سرہٗ و نور اللہ مرقدہٗ و جعل الجنۃ مثواہ''، پچیس (۲۵) اشعار پر مشتمل اس قصیدہ کے ابتدائی ابیات میں سے چند یہ ہیں:

''سوئے چمن مرا چو نسیم سحر چہ کار دارد دلم چو غنچہ در آغوش نوبہار
زیں نقشِ خامہ ام کہ بہ خورشید زد رقم مانیؔ بحیف ماندہ چو تصویر بر جدار
ژولیدہ نظم پیش کلامم برنگ زلف سحباںؔ کہ زد بلوحِ جہان نقش یادگار
از رشک نظمہائے گلستان بہار من خورشیدہ راہ خویش نیابد سوئے گذار
شد سینہ چاک چاک چو دامان گل مرا چون غنچہ نوک خار غمش کرد دلفگار'' [۶]

حضرت اخترؔ اپنے وقت کے علامہ ہونے کے علاوہ فارسی ادبیات کے ماہر بھی تھے، آپ کا فارسی دیوان مخطوطے کی

۵۔ دیوانِ علامہ اختر کڈپوی (مخطوطہ) ص: ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ اس مخطوطے سے استفادہ کا موقع راقم الحروف (راہی فدائی) کو خاندان اخترؔ کے چشم و چراغ جناب داداجاں صاحب مرحوم نے جناب سید احمد باشا عرف برکلی باشا مرحوم کے توسط سے فراہم کیا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو منور کردے۔ دوسری بار اس مخطوطے سے کچھ نقل کرنے کی ضرورت پیش آئی تو جناب داداجاں مرحوم کے فرزند ہدایت اللہ خاں اور ان کے قریبی رشتہ دار مولانا مفتی رحیم اللہ خاں نے، جن کے تصرف میں مذکورہ مخطوطہ تھا، مکمل تعاون کیا، راقم ان دونوں احباب کا شکر گزار ہے۔
۶۔ ماخذ سابق، ص: ۱۶۳

شکل میں رائل سائز کے سات سو تین (۷۰۳) صفحات کو محیط ہے۔ ہر صفحے پر تیرہ (۱۳) شعر ہیں، اس قلمی نسخے کی کتابت ان کے پوتے مولانا ذوالفقار علی خاں ضیاؔ دوم (متوفی ۱۳۶۵ھ) ابن شعاعؔ ابن اختر نے کی ہے، یہ مقتدر دیوان دو سو چھتیس (۲۳۶) غزلوں، پانچ قصیدوں، دو نوحوں اور ایک مثنوی پر مشتمل ہے جس کے اشعار ایک سو تین (۱۰۳) ہیں، یہ مثنوی حضرت ٹیپو سلطان شہید (شہادت ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء) کے احوال و آثار اور سلطان کے جنگی کارناموں کو احاطہ کئے ہوئے ہے[۷]۔ دو مرثیوں میں سے ایک سید السادات سید شاہ عبدالحمید کی وفاتِ حسرت آیات پر لکھا گیا ہے جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

بیا، اے دل کہ از غم نوحہ سازیم		ز مدحِ اشک سوئے گریہ تازیم
چراغِ آہ بر گردوں فروزیم		کہ چشم آفتاب از وی بروزیم
ملائک ہم شود پروانہ بروے		ز سودائے غمش دیوانہ بروے
بہ زخم دل نمک ریزیم از غم		ز شورِ ماتمش بخشیم مرہم
بہجر آنکہ در دوران شہیداست		مبارک نام او سید حمیدؔ است
جوان و صاحب ہمت بدوران		کہ شیر از ہیبتش چون بید لرزان[۸]

دوسرا مرثیہ اپنے لخت جگر نور نظر عبدالوہاب خاں (متوفی ۱۲۵۸ھ) کے انتقال پر ملال پر رقم کیا تھا جو نہایت اثر انگیز و پُر درد ہے، پانچ قصیدوں میں سے پچیس اور چونتیس (۲۵۔۳۴) اشعار پر مشتمل دو قصیدے شیخ و مرشد حضرت سید شاہ محی الدین باشا قادری (متوفی ۱۲۴۵ھ) کی تعریف و توصیف میں تحریر کئے گئے۔ اور دو قصیدے جن کے اشعار کی تعداد بالترتیب پینتالیس اور اٹھارہ (۴۵۔۱۸) ہے، ناگپور (مہاراشٹر) کے حکمران راجا رگھوجی راؤ بھوسلے (متوفی ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۶ء) کے نامور سپہ سالار نواب صدیقؔ علی خاں بہادر (متوفی ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۷ء) کی مدح و توصیف میں رقم کئے گئے ہیں۔ نواب موصوف بہت فیاض اور علم دوست تھے، ان کا بسایا ہوا محلہ ناگپور شہر میں ''نواب پورا'' کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا غلام رسول غمگیں ناگپوری نے ان کی وفات کی کئی تاریخیں کہی ہیں، ان میں سے دو یہ ہیں: ''آہ، این نواب شمع خانداں،'' (۱۲۴۲ھ)۔ ''از جہاں رفتہ امیرے داد گر'' (۱۲۴۲ھ)۔ ان کے فرزند نواب قادر علی خاں صاحب کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انگریزی حکومت نے پھانسی کی سزا دی تھی[۹]۔ پانچواں قصیدہ مولد و مسکن شہر کڈپہ کی

۷۔ راقم الحروف (راہی فدائی) نے مثنوی ''در مدح سلطان'' کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ''جنوب کے اصحاب کمال'' (جلد اول) میں شائع کیا ہے۔

۸۔ مخطوطۂ ہذا۔ ص: ۱۷۵

۹۔ مذکورہ معلومات ڈاکٹر شرف الدین ساحلؔ سے حاصل ہوئیں، ڈاکٹر موصوف نے اپنی کتاب ''ناگپور کا مسلم معاشرہ''

تعریف میں ہے۔ وطن کی خاک سے حضرت اختر کی عقیدت و محبت اس طویل بیانوے (۹۲)اشعار کے قصیدے میں ایک ایک لفظ سے جھلکتی ہے، یہاں ابتدا کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:

چہ شہر یست کڈپہ بملک دکن ز خاکش برد سرمہ چرخ کہن
بانجم کہ چوں دیدہ دارد نشان بہ میلے کشد کو بود کہکشان
چنیں کل زمیں زیر گردوں کجا است ارم را ازو خار گوئی بجا است
بہ شاخ درخشانِ آں روضہا طیوران جنت دہد بیضہا
ز ویرانہ اش یاسمن سرکشد گل و سنبل و نسترن سر کشد
سوادش بود پر ز رنگِ چمن گزید است رضواں در انجا وطن
زمینِ کہ جنت ہوا دار اوست ز خاکش دل حور آرام جو است
ہوایش دہد مردہ را زندگی ز آبش جہاں جست پائندگی[۱۰]

حضرت اختر نے دیوان میں غزلوں اور قصائد و مراثی کے علاوہ حضرت سعدی علیہ الرحمہ (متوفی ۶۹۱ھ) کی مشہور تصنیف ''کریما'' کے طرز پر علیما، نعیما، قیوما اور حکیما کے نام سے پند و حکمت پر مبنی عمدہ رسائل تحریر کئے ہیں۔ حکیما کا سال تصنیف سنہ ۱۲۵۵ھ ہے جس کا ذکر آپ نے رسالہ کے اختتام پر اس طرح کیا ہے:

حکیما شد از نام ایزد تمام گرفت است نظمم بخوبی نظام
بحکمت نوشتم چنیں پندہا کہ ہر بیت روشن دُرِ بے بہا
خریدار باید کہ گیرد بجان دہد سود اورا خدائے جہان
بتاریخ ایں دل نزنجاہ بود ہزار و دوصد پنج و پنجاہ بود
چوں ایں لعل و یاقوت کوہ نجف نہ گوہر بہ معدن، نہ دُر در صدف[۱۱]

دیوان کے آخری حصہ میں ایک سو پینسٹھ (۱۶۵) اشعار کا ایک طویل ''شہر آشوب'' بعنوان ''در شکایت سپہر'' لکھا ہے جس میں مخلوقات پر فلک کی جانب سے جاری زیادتیوں اور اس کے شدید حملوں کے شکار انس و جن کی دلی کیفیات کا بہترین نقشہ کھینچا ہے۔ علاوہ ازیں دیوان کے اختتام پر چھتیس (۳۶) اشعار پر مشتمل مناجات میں اپنی حالت زار واضح کرتے ہوئے اللہ رب العزت سے نصرت و امداد طلب کی ہے۔ مناجات کے چند شعر ذیل میں پیش ہیں:

میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۔ مخطوطہ۔ ص: ۵۱۸۔۵۱۹

۱۱۔ ماخذ سابق، ص: ۴۱۲

الٰہی نگاہیکہ بیچارہ ام چو گل از دل خود دو صد پارہ ام
من آنم کہ در آرزو یت مدام زنم شعلۂ غم بہر صبح و شام
دلم ہم چو شمع آتش افروختہ بداغ جگر دیدہ را دوختہ
سرشکم بہر سو دود موج موج ز طوفان سرِ خود رساند باوج
جگر را گزارم بآتش چو موم گریزم بصحرائے وحشت ز قوم
چو فوّارہ اشکم بود تند و تیز ز خون سوئے خورشید شد لعل ریز
ز داغ تو دارم دلِ لالہ وار چراغ ازان ہم برم در مزار
چو مہ در دلم داغ آتش زدہ چو خورشید شد سینہ آتش کدہ[۱۲]

مناجات کے آخری اشعار اس طرح ہیں:

دریں گلشنم سروِ آزادہ دار و لے چوں بنفشہ سر افتادہ دار
چو غنچہ دہ از خارِ خود خستگی چو گل ساز آزادم از بستگی
فسردہ چو شبنم مکن خاطرم بہ گلزار انوار کن ناظرم
چو طوطیم آئینۂ خود نما کہ چو شد زمن نغمۂ جاں فزا
بفضل خدا وند رب الانام بحق محمد علیہ السلام
ز اختر کنوں یاد گاری مدام شد ایں نسخۂ دلکشا با تمام[۱۳]

علامہ اختر نے عہد آصف جاہی کے نامور نائب وزیر اعظم چندو لال (دور ملازمت ۱۸۰۸ء تا ۱۸۴۳ء) کے ماموں فارسی کے جید عالم قد وادیب لچھمی نارائن شفیق (متوفی ۱۲۲۳ھ) سے شعر و سخن کے رموز و لطائف سیکھے ہیں، جناب شفیق نے مایہ ناز مربیّ واستاذ حسّان الہند میر غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) مصنف ''سبحۃ المرجان'' و ''خزانۂ عامرۃ'' وغیرہ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ جس کا اظہار آپ نے بعنوان ''درصفت استاذ خودمی فرمایند'' کے تحت کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

شفیق و صاحبم استاذ لچھمی نارائن کہ گوے برد بہ ہندی و پارسی بجہان
گرفتہ فیض ز خدام حضرت آزاد نثار باد بآں خاک رحمت یزدان[۱۴]

علامہ اختر متداولہ و مروّجہ علوم و فنون سے آراستہ ہونے کے باوجود بڑے ہی متواضع تھے۔ خداترسی و

۱۲۔ ماخذ سابق، ص: ۷۰۱
۱۳۔ ماخذ سابق، ص: ۷۰۳
۱۴۔ ماخذ سابق، ص: ۱۷۷

خاکساری رگ وریشے میں سرایت کر گئی تھی۔ اپنے وقت کے مشہور معلّم و مربیّ تھے،ان کے پوتے مولانا ذوالفقار علی خاں ضیاؔ دوم (متوفی ۱۳۶۵ھ) نے دادا کی بعض خصوصیات کا ذکر اپنی مدحیہ اردو نظم میں کیا ہے۔ نظم کے شعر ملاحظہ ہوں:

فاضل شہر اخترؔ ذی شاں — ذات اقدس تھی جن کی فیض رساں
نام نامی شہیر پیر و جواں — ذوالفقار علیؔ خانِ زماں
خاص کر جن کا فیض با سادات — عام تر کل جہاں میں تھے برکات
سعدیؔ و عرفیؔ، حافظِ شیرازؔ — طرز مضموں میں جن کے ہیں ہمراز
ہر سخن جن کا نفس الہامی — ہم کلامِ نظامیؔ و جامیؔ
درس و تدریس کی تھی حرص و ہوس — جن کے شاگرد دو ہزار تھے بس
عالمِ با عمل بہ زہد و رضا — بس ولایت کا جنکے تھا شہرا
محیؔ دیں اسم اقدس والا — قدّس اللہ سرّہٗ ابدا
فیض سے جن کے دل تھا آئینہ — جس کا سینہ تھا بوعلیؔ سینا
اور اخترؔ سے اقتباس شعاعؔ — بہ طفیل شعاعؔ ہے یہ ضیاؔ
بطفیل رسولؐ خیر ورا — جَعَلَ اللہ جنّۃ الماویٰ
ہے ضیاؔ سے یہ انورؔ تابان — لطف یزداں سے ہو وحید زمان [۱۵]

دیوان حضرت اخترؔ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو طویل عمر ملی، انہوں نے حضرت سلطان ٹیپو کی شہادت ۱۲۱۳ھ کے بعد مرثیہ لکھا، اس وقت ان کی عمر اگر پینتیس (۳۵) سال بھی فرض کرلیں تو آپ کی ولادت کا سال ۱۱۷۸ھ متعین ہوتا ہے، ”حسب حال“ ۱۲۲۸ھ میں، حکیماؔ ۱۲۵۵ھ میں اور اپنے فرزند عبدالوہاب خاں کا مرثیہ ۱۲۵۸ھ میں رقم کیا تھا۔ اگر مان لیں کہ اس کے بعد کم از کم دو سال آپ بقید حیات رہے ہیں تو آپ کی وفات سنہ ۱۲۶۰ھ یا اس کے آس پاس ہونے کا امکان ہے۔ آپ کی آرزو تھی کہ وفات کے بعد لوح مزار پر ان ہی کے اشعار کندہ ہوں، چنانچہ انہوں نے ”ایں رباعی بر تربت اخترؔ بر سنگ باید

۱۵۔ ماخذ سابق۔ دیوان کے آخر میں ملحقہ نظم جس پر صفحہ نمبر لکھا نہیں گیا۔ اس نظم کے بعد مولانا ضیاؔ کے تحریر کردہ دو مرثیے ہیں، ان میں سے ایک کڈپہ کے خانوادۂ سادات کے چشم و چراغ عارف باللہ حضرت مولانا شاہ سید حسین عرف سید صاحب کی رحلت پر لکھا گیا ہے، دوسرا مرثیہ کڈپہ کے قاضی خاندان بخاریہ کے فرد فرید حضرت مولانا قاضی سید شاہ مصطفی حسین بخاری قادری علیہ الرحمہ کے وصال پر تحریر کیا گیا ہے۔

نوشت'' کے عنوان کے تحت درج ذیل قطعہ رقم کیا ہے:

نہ شد بمحفلِ معنی چو من دریجا کس چو آفتاب فروزد چراغ بینائی
بزیرِ خاک بحکم خدا روم اختر جز او رفیق نباشد مرا بہ تنہائی[۱۶]

کڈپہ کے نامور و مشہور حاکم میانہ عبدالنبی خاں (متوفی ۱۱۵۸ھ) نے اپنی حکومت کے دوران حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارک کو محفوظ کرنے کے لئے ایک عمارت تعمیر کی تھی جس کا محل وقوع بہادر خاں مسجد کا وسیع صحت تھا، یہ عمارت مرور زمانہ کے ساتھ بوسیدہ ہو کر منہدم ہوگئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر وہاں کے حکمرانوں نے اس آثار محل کو از سر نو تعمیر کرایا تھا، جس کا تاریخی قطعہ حضرت اختر نے تحریر کیا۔

تاریخی قطعہ یہ ہے:

پیش ازین بانئ ایں آثار رشک آسمان بودہ است عبدالنبی خاں میر عمدہ خاندان
منہدم شد از ممر کہنگی اکنوں تمام نو بنا کردند راس و نومنش در یک زمان
حاکم وقت اند آنہا از جہاں بانی و عدل شد بمدّ خویش ''آثار خجستہ'' سن آں[۱۷]

۱۱۷۷ء

دیوان اختر کی غزلوں کی ابتدا حمد باری تعالیٰ سے ہوئی ہے، حضرت اختر نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثنا میں دو غزلیں رقم کی ہیں جن میں الفاظ کی شوکت اور کلام کی ندرت کا امتزاج موجود ہے، خدا کی تعریف و توصیف کمال ہنر کے ساتھ اشاروں اور کنایوں میں ادا کی گئی ہے۔ یہاں دونوں غزلیں پیش کی جارہی ہیں:

(۱)

ای نا رسا بہ اوجِ ثنایت ، گمانِ ما قفلِ دہان شود، زِ بیانت زبانِ ما
زان جلوہء جمالِ تو ما را ز خود ربود کائینہ ایم جز تو نہ پیدا ، نشانِ ما
شد زخم ریزِ ناطقہ وصفِ کمالِ تو مہتاب رو نمود، بہ سوئِ کتانِ ما

۱۶۔ ماخذ سابق، ص: ۱۷۷۔ حضرت اختر نے مذکورہ چار مصرعوں کو ''رباعی'' کہا ہے، چونکہ یہ مروجہ اوزانِ رباعی میں سے نہیں ہے اس لئے اسے اصطلاحی رباعی نہیں کہا جاسکتا ہے، البتہ ان چار مصرعوں کو ''قطعہ'' کہیں تو درست ہوگا۔ لیکن تیرھویں صدی کے بعض شعرا نے چار مصرعوں کو لغوی طور پر ''رباعی'' کہا تھا، ہمارے دور میں علامہ اقبال نے بھی متقدمین شعرا کی پیرکی ہے، شاید کہ حضرت اختر کی تمنا بر آور نہیں ہوئی۔

۱۷۔ ماخذ سابق، ص: ۱۷۶۔ راقم الحروف نے اپنی تصنیف ''علاقۂ کڈپہ کے نایاب تاریخی کتبے'' میں صفحہ ۱۴۰-۱۴۱ پر اس کی تفصیل بیان کی ہے۔

دامِ تو مرغِ زیرکِ دل را نمود صید | بود، ار چہ بر نہالِ قدم آشیانِ ما
زین نغمہء ثنا کہ زَنَد سُرمہ در گلو | گردید لال، طوطیِ شیرین بیانِ ما
شد دل فدا بہ ذرہ ء خاکِ حریمِ تو | نورِ وجود یافت ، ازان مہرِ جانِ ما
آنجا کہ غیرِ ذاتِ تو، کس راگذار نیست | بودہ بہ رنگِ نقش، زحیرت مکانِ ما
غیر از درِ تو بر درِ دیگر کجا رویم | زآنجا کہ خانہ ات شدہ ، دارالامانِ ما
دل با ہجومِ اشک، بہ مصری کہ می رود | یوسف رسد بہ بدرقۂ کاروانِ ما
اختر برون ز داغِ درون شعلہ برفروخت | چون شمع، روشن است متاعِ دکانِ ما

(۲)

ای از ہوائے وصل تو زد مرغِ جانِ ما | پرواز و ماند از پرِ عنقا نشانِ ما
حیران نظر چوآئنہ پیشِ ثنایِ تست | طوطیِ طبعِ ناطقِ شیرین بیانِ ما
از تیغِ وصفِ کو بہ سیاست کشیدہ است | گردد دو نیم، گردنِ طولِ بیانِ ما
ہرگز بہ قندِ حصر نداریم احتیاج | پُرازشکَر، بہ شکرِ تو گردد، دہانِ ما
بگریستیم با ہمہ زاری ز دردِ دل | شُد موج ہایِ بحر ، ز اشکِ روانِ ما
آن شعلہ ای کہ سوزِ دلش نام کردہ اند | آتش چو نی فگند بہرِ استخوانِ ما
آن گل کہ موجِ رنگ بہرِ برگِ گل زَند | صد شورِ عندلیب برآرد ز جانِ ما
این رنجِ ما، بہ محنتِ ایّوب بر مسنج | کردند از فراقِ بتان ، امتحانِ ما
اخترؔ بہ بُرجِ خویش بسرعت بہ می رویم | غافل ازین وبال کہ گیرد، عنانِ ما

حمدیہ غزلوں کے بعد آقائے نامدار سرور کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں دو غزلوں کے ذریعہ نعت و مدحت کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ غزل کی ہیئت میں نعت پاک کہنے کا رواج اگرچہ قدیم دور سے چلا آرہا ہے مگر علامہ اخترؔ نے اپنی نعتوں میں اوج خیال و بلندئ فکر کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کی صراحت کے بغیر اشاروں اور استعاروں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں تحفۂ عقیدت و محبت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی، نعتوں کا ایمائی و اشارتی اسلوب قابل داد و تحسین ہے۔ دونوں نعتیں ملاحظہ ہوں: (پہلی نعت پاک)

چون شود، آگاہ دل از رازِ پنہانِ شما | وہم در حیرت چو مرغ، از نورِ عرفانِ شما
در عدم بودیم، چون آئنہ با زنگ آشنا | عکس، چون صیقل فتاد از رویِ رخشانِ شما
سایہ اندازِ فلک آن دامنِ دور از غبار | زیورِ فکرِ دو عالم شد، گریبانِ شما
زان تبسّم غنچہ ہایِ باغِ دین گل کردہ اند | شور در جانِ رسولان زد، نمک دانِ شما

گلبنِ ہستیِ آدم در خزان بود از عدم — از کرم بارید بہ رویِ ابرِ احسانِ شما
دل چو، ابراہیم خوش از آتشِ الفتِ مُدام — جانِ ما گردد، چو اسمعیل قربانِ شما
اختر از ناسورِ دل، در غیبِ بی مرہم خوش است — بر اُویس افگند، پیکان تیرِ مژگانِ شما

دوسری نعت شریف:

اے بچشمِ عرش کحل از خاک ایوان شما — جوہر اول بود یک بندہ دربانِ شما
اولوالعزتے کہ در تاجِ فرق عالم اند — ذُلّہ خوارِ قرب حق گشتند از خوانِ شما
از پئے افزو نئ نورِ شریعت در جہان — شد ز یک دو ماہ از شمشیر فرمانِ شما
دیگر از خواہش بخوانِ خلد کئ رو آورد — دست از دارین شوئیدہ است مہمانِ شما
در رہِ تسلیم جانہا بال بسمل می زنند — بارہا گرم است گویا عید قربان شما
گلبن آدم ز ابر رحمتت گردید گل — شد دل بلبل نوائش شکر گویانِ شما
روز حشر ار امتحان گیرند از ایمان و دین — دست آویز صحیح ماست برہانِ شما
مزدِ از عفو گنہ خواہد بفردائے حساب — اختؔر مدّاح یعنی آفریں خانِ شما [۱۸]

ان کے کلام سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف قادرالکلام پُر گو شاعر تھے بلکہ آپ رموز و لطائف شعری سے بھی کماحقہٗ واقف تھے، اشعار میں، زبان و بیان کی سلامت و روانی کے علاوہ تشبیہات کی کثرت، اشارات و کنایات کا وفور اور صنائع و بدائع کا بر محل استعمال کو فارسی شعر و سخن کے ممتاز ماہر کی حیثیت سے روشناس کراتا ہے۔ راقم السطور کو یقین ہے کہ علامہ اختؔر کا شمار ہندوستان کے صف اوّل کے فارسی شعرا میں ہے اور فارسی ادبیات ہند میں ان کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقع پر یہ بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ ہندوستان کے اکثر فارسی شعرا کے کلام میں کبھی کبھی مقامی زبان و تہذیب کے اثرات در آتے ہیں، اختؔر کی شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں مگر یہ کوئی عیب نہیں، زبان و بیان کی وسعت کے نظریے سے دیکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

مخطوطے کے متعلق ایک اور بات یہ بتانی ہے کہ اس قلمی نسخے کی کتابت خط نسخ میں قدیم روایات کے مطابق کی گئی ہے۔ قدیم دور میں یہ رواج تھا کہ اگر غزل کے قوافی مثلاً گلستاں، کہکشاں، جاوداں وغیرہ ہیں تو ان میں حرف رَوی، 'ن' کا اظہار مکمل کیا جاتا تھا، نونِ غنہ کا استعمال متقدمین شعرا کے یہاں مفقود رہا ہے۔ اس مخطوطے میں بھی اسی نہج پر کتابت کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں یائے مجہول (ے) کے مقام پر یائے معروف (ی) قدما کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔ راقم الحروف نے مخطوطے کے مطابق ہی اپنے مضمون میں نقل کیا ہے،

۱۸۔ ماخذ سابق، ص: ۳۔۴

مگر بعض مقامات پر جہاں معروف کی قرأت میں غلطی کا امکان نظر آیا، وہاں یائے مجہول لکھ دیا ہے۔ وماعلینا الی البلاغ۔ آخر میں دیوان سے چند غزلیں پیش کی جارہی ہیں ملاحظہ ہو:

نسیم از کوی آن گل رو، سحر گہہ چون وَزید اینجا — دلم چون بوی گل آشفتہ در صحرا دَوید اینجا
فلک خم گشتہ می بیند بہ رنگ بسملم شاید — بہ عمری این چنین دیگر ، تماشائی ندید اینجا
تماشا کن کہ از خاکم ، بہارِ لالہ می جوشد — شدم از تیغ ابرویت، بہ داغِ دل ، شہید اینجا
بیاو آن لبِ شیرین ، غبارِ سینہ طوفان زد — چو نَہرِ خُلد ، جویِ شیر از اشکم دَوید اینجا
مرا بر ملکِ دو عالم ، تصرّف سکّہ خواہد زد — ہمایِ سایہ اش بر سر ، دوبارم گسترید اینجا
بہ خاکِ کویِ آن لیلٰی چنان گم شُد دلِ مجنوں — کہ چرخ از بس ہجوم دیدہء اختر ندید اینجا

....

دلِ پُر داغ لالہ زارِ منست — رنگِ گل خون چشم زارِ منست
سر نہد اشک گر بنوک مژہ — شعلۂ رنگِ گل بخار منست
در قلم آورم سخن زان خط — بخزاں سبزۂ بہار منست
آہ گر زیں دل فسردہ جہد — شررِ سنگ کوہسارِ منست

....

رنگی کہ بگلزارِ دوام است کدام است — سرویکہ ہمیشہ بخرام است کدام است
آن دل کہ با سباب جنوں خانہ بدوش است — آوارہ پیٔ یار مدام است کدام است
در باغ محبت کہ گلش شعلۂ آتش — آن نرگس مخمور نہ رام است کدام است
گویند باختر جوانمرد دریں دور — باہمت مردانہ کدام است کدام است"
"چوں سمندر ساز ہائے عشرتِ ما آتش است — مطرب ما ساقی ما بادہ پیما آتش است
بلبل از دیو انیگہا رائگان دل را مسوز — رنگ گلہا نیست در دامانِ صحرا آتش است
عشق از بس دادہ است از سوختن مارا رواج — از قدم تا فرق مارا شمع آسا آتش است
مرد مک از جوش موجِ اشک ما دارد زیاں — نوبت قرطاس راہم آب دریا آتش است
بے تو جز سوزش دلم ہر گز نمی باید قرار — چو زنِ ہندوئ مردہ منزلِ ما آتش است
در جنوں تنہا نہ شد جانم بآتش سوختہ — از شرارِ نالہ ام چون باعضا آتش است
اے خیالش در دل اختر میا اکنوں بناز — کز ہجومِ شعلہ ہائ آہ اینجا آتش است

....

ای جلوہ غافل از دلِ حیران بیا بیا — آئنہ ایست پیشِ تو عُریان بیا بیا

زد سینہ ام ز آتشِ ہجران ، ہجومِ داغ / زین لالہ ہا خوش است خیابان بیا بیا
ای دل بہ دوشِ اشک ، ازین دیدہ سفید / پوشیدہ سرخ جامہ ، خرامان بیا بیا
از قطرہ ہایِ اشک بہ صد زاری و گُداز / بس شمع روشن است، بہ مژگان بیا بیا
تا چند از جفا ، بہ ہوا خواہ سرکشی / رنگِ بہار، سویِ گلستان بیا بیا
چون مرغ سویِ کنکرہ مدّعا رسی / ای فکرِ نارسا ، بہ گریبان بیا بیا
ظالم ہوایِ سیر ، کشد دامنت اگر / یک گلشن است ، خونِ شہیدا ن بیا بیا
با رویِ تَست مردم چشم تہی ز نور / سویم چو روشنیِ چراغان بیا بیا
چون تیر بر ہوایِ فلک ، بال و پر زنی / ای آہِ ہرزہ دَو بہ رقیبان بیا بیا
طوفانِ نوح خشک ، کجا ماندہ ای بہ خاک / طغیان کنان بہ کلبہ ء احزان بیا بیا
ہمچو پیادہ سیلِ سرشکم شود روان / ای شہ سوارِ آہ ، شتابان بیا بیا
اختر ز زہدِ خشک بہ افسردگی مَنال / سعی کن و بہ محفلِ رندان بیا بیا

....

بیار بادہ و بنواز بزمِ یاران را / شناس مغتنم ،ایّامِ نوبہاران را
دمید سبزہ چو مویِ خطت زُمرّد گون / شگفت رنگ چو ، لعلِ تو لالہ زاران را
بیا نگر کہ جہان قابلِ تماشا نیست / کہ جوشِ رنگِ بہار است گلِ عذاران را
تُرا وقوف کجا، خسرو فلک از ظلم / نہان بہ قتل برانگیخت تیغ داران را
کجا بہ محفلِ رندان بُود، رہِ زاہد / گذار نیست بہ جنت گناہ گاران را
بہ گاہِ وصل بُود ، بوسہ ء صنم زان خوش / کہ دل پسند بود نقل بادہ خواران را
ز سعی منع نگردد ، روانگیِ سرشک / گدازِ چشم زآغوشِ بی قراران را
شہیدِ نرگسِ مستانہء کہ گردیدم / ز من پیالہ ز نرگس رسد بہاران را
مخور فریبِ گلِ باغ این جہان اختر / کہ کرد خوار ز سودا، دلِ ہزاران را

....

ای از بہارِ رویِ تو گلِ کرد باغ ہا / گردید از خیالِ تو، روشن چراغ ہا
در محفلی کہ بی تو ، سُرایند نغمہ اش / اُفتاد شورِ صورِ درون دماغ ہا
خم گشتہ آسمان، بسوی کُرہ زمین / نوشد شرابِ خون ، جگر از ایاغ ہا
اکنون ز سوزِ آتشِ گلِ بلبلم بسوخت / در بیضہ بود، چون پرِ طاؤس داغ ہا
دودِ سیاہ خیزد ازین داغ دارِ دل / طاؤس را نگر کہ چہ زاید کلاغ ہا
نارِ دلم بہ درد رود اشک، رنگ زرد / چون منعم این فقیر چہ دارد فراغ ہا

آن رنگِ گل، نیافتہ بر صبح چون نسیم در باغ ہا دویدم و رفتم بہ راغ ہا
در ظلمتِ فراق، چنان روی رشکِ ماہ افروختم ز اشک بہ مژگان چراغ ہا
ویرانۂ جہان نبود بہر خورمی بیہودہ ہیچو غول نیایٔ بلاغ ہا
اختر مجو، ز گریہ چو دل شد سبیلِ اشک پیدا بہ روی آب، نگردد سراغ ہا [۱۹]

حاصل کلام یہ کہ ہندوستانی فارسی شعریات میں علاّمہ اختر کڈپوی کا دیوان فکر وفن دونوں اعتبار سے قابل توجہ اور لائق تحسین ہے۔ خصوصاً جنوب کے فارسی منظر نامے کو دیکھا جائے تو حضرت اختر صف اوّل کے شعرا میں نظر آئیں گے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان سے فارسی گویا ختم ہے مگر خدا کا شکر ہے کہ آج بھی مدارس اور جامعات میں فارسی زبان وادب کی تدریس جاری ہے اور مختلف موضوعات پر تحقیق کا کام بھی کیا جارہا ہے، راقم السطور (راہی فدائی) کی گزارش ہے کہ فارسی کے اساتذہ اپنے ریسرچ اسکالرز کی توجہ روایتی موضوعات پر مبذول کرانے کے ساتھ اپنے علاقے کے ماہرینِ فارسی شعر وادب کی تخلیقات پر بھی ریسرچ کرانے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے بزرگوں کی گرانقدر علمی خدمات کے اعتراف وقدردانی کی توفیق عطا فرمائے۔

۱۹۔ ماخذ سابق، ص: ۴۔۱۱۔۲۱۔۲۳۔۹۷۔۹۸۔۱۰۰۔ حضرت اختر کے دیوان سے غزلوں کو نقل کرنے میں محترمہ ڈاکٹر لیلیٰ عبد خجستہ صاحبہ (تہران) کا تعاون حاصل رہا، راقم محترمہ کا شکر گزار ہے۔ محترمہ لیلیٰ عبد صاحبہ نے بتایا کہ ایران کے اہل سخن حضرات قدیم روایات ہی پر آج تک گامزن ہیں۔
اس دیوان کے حصول میں اور اس کے بعض صفحات کو نقل کرنے میں جناب ڈاکٹر سید اقبال خسروؔ اور برادر عزیز مولوی قاضی ٹی، بشیر احمد ثنائی کا تعاون حاصل رہا ہے، راقم ان دونوں عزیزوں کا شکر گزار ہے۔

اخبار علمیہ

مرکز برائے عربی زبان کی نئی ویب سائٹ کا آغاز

ابوظبی مرکز برائے عربی زبان متحدہ عرب امارات کے محکمہ ثقافت وسیاحت سے وابستہ ہے۔اس نے حکومت کی ڈیجیٹل تبدیلی کو نافذ کرنے کے لیے اپنی نئی ویب سائٹ کا آغاز کیا ہے۔ نئی ویب سائٹ اپنا مواد عربی اور انگریزی میں فراہم کرتی ہے اور اس کا جدید ترین ڈیزائن اعلیٰ ترین ڈیجیٹل معیار کا حامل اس لیے تیار کیا گیا ہے تاکہ اس کے زائرین کو اس کے مختلف شعبوں سے استفادہ اور اس کے پیش کردہ مواد کو دیکھنے میں آسانی ہو۔ مرکز کے قائم مقام ایگزیکٹو ڈائریکٹر سعید حمدان الطنجی نے کہا کہ نئی ویب سائٹ ہماری خواہش کے مطابق ہے اور یہ مرکز کے حصول اہداف کے لیے ڈیجیٹل دور کی ضرورتوں سے ہم آہنگ رہنے کی اہمیت سے ہماری واقفیت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ ویب سائٹ اپنا مواد کئی حصوں میں پیش کرتی ہے۔ زبان اور ثقافت کے تحت تخلیقی مواد میں تازہ ترین تصنیفات اور ترجموں کو دکھایا جاتا ہے۔ تحقیق اور رپورٹس وہ حصہ ہے جس میں سب سے اہم اور تازہ ترین مطالعات شامل ہیں۔ مرکز نے یہ کارنامہ عربی زبان سے متعلقہ شعبوں کے توسط سے انجام دیا ہے۔ایک فہرست میں شامل عربی کے سو اہم ترین ناول سے قارئین کو واقفیت ہوتی ہے۔ دوسرا پروجیکٹ بیسویں صدی اور ورثہ سے متعلق ہے۔اس میں ایک سو کتابوں کی تفصیلات ہیں۔اس ویب سائٹ پر ریفریڈ میگزین ہے۔ یہ ایک عرب سائنسی جریدہ ہے جو عربی زبان وادب، ثقافت اور جدید مسائل پر مطالعات اور تحقیق کی اشاعت سے متعلق ہے۔ ایک باب ''ہم عربی بولتے ہیں'' کے نام سے ہے۔اس کے تین حصوں میں پہلا لینگویج ٹیسٹ ''سمہ'' ہے جو عربی زبان میں مہارت کی بین الاقوامی سند کا نام ہے اور دوسرا ''سعود اور وروز'' کے نام سے متعدد ویڈیوز کا مجموعہ ہے۔ یہ ویڈیوز مختلف حالات میں ابتدائی افراد کو عربی زبان سکھانے کے لیے ہیں اور تیسرا حصہ ''عربی زبان کے دوست'' کے نام سے ہے۔ عربی زبان کے دوستوں کے لیے سالانہ مقابلہ پر مشتمل ہے جس میں مقامی اور غیر مقامی عربی بولنے والے شامل ہیں۔ ''ڈیجیٹل لائبریری اور فصیح بچہ'' سائٹ نے ڈیجیٹل پہلو کو اجاگر کرنے پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے اور ڈیجیٹل لائبریری سیکشن کے ذریعہ اشاعت کے میدان میں ہونے والی ترقی کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس میں مرکز کی ڈیجیٹل طور پر تبدیل شدہ کتابیں، ای بک، آڈیو اور انکشافات سے متعلق مواد ہیں۔ ایونٹس سیکشن، مقامی عرب اور بین الاقوامی نمائشوں یا مرکز کی طرف سے منعقدہ کانفرنسوں کو پیش کرتا ہے۔ ''الطفل الفصیح'' سیکشن بچوں اور نوجوانوں کی پسندیدہ کتابوں اور کہانیوں کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہے۔ ''معنیٰ گائیڈ'' سروس ایک خصوصی ڈیجیٹل ڈکشنری ہے۔اس کا مقصد ڈیجیٹل عربی مواد کو سپورٹ کرنا ہے۔ مرکز کی طرف سے فراہم کردہ رقم وانعامات، سیکشن عربی زبان کی

ترویج و تشہیر کی حکمت عملی کے مطابق جدید منصوبوں کو روبہ عمل لاتا ہے۔ ''میڈیا سینٹر'' مرکز اور اس کے کردار، اہداف اور نقطۂ نظر کو متعارف کرانے کے لیے ایک خاص سیکشن ہے۔ان معلومات سے مرکز برائے عربی زبان کی نئی ویب سائٹ کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ (روزنامہ الاتحاد عرب امارات، ۸ فروری ۲۲ء بحوالہ انقلاب، وارانسی ۹؍۲؍۲۲ء)

رفتار دماغ کے متعلق ایک دلچسپ تحقیق

جرمنی کے ماہرین نے ۱۲؍لاکھ لوگوں کے دماغی جائزہ کے بعد کہا ہے کہ انہوں نے اس خیال کو پیچھے چھوڑ دیا ہے کہ بیس سال کی عمر میں دماغ سب سے تیز رفتاری سے سوچتا ہے۔ان کے مطابق سوچنے کی رفتار کسی شخص کے بیس سے تیس سال کے ہونے تک بڑھتی ہے اور ساٹھ سال کی عمر تک یہ درست بنی رہتی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ دماغ کی قوت تب تک کمزور اور سست نہیں ہوتی جب تک کہ جسم سست اور لاغر نہیں ہوتا۔ماہرین کا کہنا ہے کہ ہمارے نتیجے دماغ کی رفتار کو بڑھتی عمر کے ساتھ آنے والی سستی ماننے والی روایتی سوچ کو چیلنج دیتے ہیں۔گذشتہ تحقیقی نتائج یہ اشارہ دیتے ہیں کہ چالیس سے پچاس سال کی عمر کے لوگ فکر و سوچ کے معاملہ میں آہستہ رو ہوتے ہیں۔یہ جائزہ ایک سؤال کے محدود رد عمل پر منحصر تھا۔نئے مطالعہ میں ہیڈلبرگ یونیورسٹی کے محققین نے ایک الگ شماریاتی رد عمل کا استعمال کیا۔ماہرین نے ۲۰۱۶ء اور ۲۰۱۸ء میں ۱۰؍سے ۸۱؍سال کے ۱۲؍لاکھ لوگوں کے دماغی تجزیہ کے نتائج کو تیار کیا۔انہوں نے پایا کہ زندگی کی ۸۰ ویں منزل میں قدم رکھنے کے بعد دماغ کی رفتار تیزی سے خراب ہوتی ہے۔(ہندی روزنامہ، ہندوستان، وارانسی ۲۰ فروری ۲۲ء ص ۱۳)

اسرائیل کا پہلا کوانٹم کمپیوٹر

اسرائیل نے بیس کروڑ شیکل (تقریبا ۴۶۰؍کروڑ ہندوستانی روپئے) کے صرفہ سے اپنا پہلا کوانٹم کمپیوٹر تیار کرنے کا اعلان کیا ہے۔اسرائیل کی انویشن اتھارٹی (آئی آئی اے) نے بتایا کہ اس منصوبہ کے لیے وزارت دفاع میں آئی آئی اے اور ڈائریکٹوریٹ آف ڈیفنس آر اینڈ ڈی (ایم اے ایف اے ٹی) کی جانب سے مالی اعانت فراہم کی جائے گی۔رپورٹ میں ہے کہ کوانٹم کمپیوٹیشنل قابلیت اسرائیلی ایکو سسٹم کی تکنیکی بنیاد رکھے گی جو مستقبل میں سلامتی، اقتصادیات، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور سائنس میں پیش رفت کی رہنمائی کرے گا۔انوویشن اتھارٹی براہ راست یا کلاڈر سائی کے ذریعے کلکولیشن کے لیے کوانٹم کمپیوٹیشنل انفرااسٹرکچر کی تعمیر اور ترقی پر توجہ دی جائے گی۔(سیاست، حیدرآباد ۱۷؍۲؍۲۲ء ص ۴)

مصری اسٹیٹ کونسل میں پہلی خاتون جج کا تقرر

ریاستی کونسل (مجلس الدولۃ) ۱۹۴۶ء میں ایک خود مختار ادارے کے طور پر قائم کی گئی تھی جو شروع میں انتظامی تنازعات اور تادیبی معاملات پر فیصلہ کرتی تھی۔ اب وہ مصر کی اعلیٰ ترین عدالت کے طور پر کار گزار ہے۔ گزشتہ برس اس کونسل میں مختلف عہدوں کے لیے خواتین کا انتخاب عمل میں لایا گیا تھا۔ ان ۹۸، عہدہ یاب خواتین میں رضویٰ حلمی کا نام بھی شامل تھا۔ خبر ہے کہ اسٹیٹ کونسل میں رضویٰ حلمی کو پہلی خاتون جج کے عہدہ پر فائز کیا گیا ہے۔ جو اپنے آپ میں ایک تاریخ ہے۔ کونسل برائے خواتین کی سربراہ مایا مرسی کا بیان ہے کہ ۵، مارچ مصری خواتین کے لیے ایک نیا تاریخی دن بن گیا ہے۔ مصر میں سینکڑوں خواتین وکلا کی موجودگی کے باوجود ایک خاتون کو جج بننے میں کئی دہائیاں لگ گئیں۔ تہانی الجبالی پہلی خاتون تھیں جن کا ۲۰۰۳ء میں مصر کی اعلی دستوری عدالت کے نائب صدر کے عہدہ پر تقرر کیا گیا تھا اور وہ اس عہدے پر ۲۰۱۳ء یعنی تقریباً ایک عشرے تک فائز رہیں۔ واضح ہو کہ سب سے زیادہ آبادی والے عرب ملک مصر میں ۱۹۵۶ء میں عورتوں کو رائے دہی اور عوامی عہدہ کے لیے انتخاب میں حصہ لینے کا حق ملا۔ اس وقت ۵۶۹ رکنی پارلیمنٹ میں تقریباً ایک چوتھائی یعنی ۱۶۸ خواتین رکن پارلیمان ہیں۔ اس کے باوجود وہاں آج بھی عورتوں کے ذاتی حقوق پر مردوں کی اجارہ داری ہے۔ زیادہ تر خواتین کو اپنے بچوں اور ان کی ذاتی زندگی پر کوئی اختیار نہیں۔ روایت کے مطابق یہ ذمہ داری مردوں کے سر ہی ہے۔ ۲۰۲۱ء میں الجامع الازہر کے مفتی اعظم نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے خواتین کے حقوق کے متعلق بات بھی کی اور کہا کہ کوئی مذہبی حکم خواتین کو تنہا سفر کرنے، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے یا وراثت کے حقوق میں مساوی حصہ لینے سے نہیں روکتا (اعتماد، حیدر آباد ۸ مارچ ۲۲ء ص ۵)۔

آمرانہ ممالک کی فہرست پر رپورٹ

دنیا بھر میں جمہوری صورت حال کے متعلق وی ڈیم (ورائیٹیز آف ڈیموکریسی) انسٹی ٹیوٹ کی ایک حالیہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۵، ممالک میں جمہوریت کی نئی لہر دیکھی جا رہی ہے۔ جب کہ ۳۲، ممالک تاناشاہی کی زد میں ہیں۔ ڈیم کے لبرل ڈیموکریسی انڈکس (ایل ڈی آئی) کی بنیاد پر ممالک کی درجہ بندی کی گئی ہے جس میں جمہوریت کے انتخابی اور لبرل دونوں پہلوؤں کو شامل کیا جاتا ہے اور جمہوریت کی سب سے نچلی سطح صفر اور اعلیٰ سطح ایک مانی جاتی ہے۔ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ ایک دہائی کے دوران ایشیا پیسیفک خطہ میں افغانستان، بنگلہ دیش، کمبوڈیا، ہانک کانگ، تھائی لینڈ، اور فلپائن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں تاناشاہی کے معاملہ میں سر فہرست ممالک میں ہے۔ کم از کم چھ ممالک برازیل، ہنگری، انڈیا، پولینڈ، سربیا اور ترکی ہیں۔ رپورٹ میں

مزید کہا گیا ہے کہ تکثیریت کی مخالف جماعتوں اوران کے رہنماؤں میں جمہوری عمل کا فقدان ہے۔وہ اقلیتوں کے بنیادی حقوق کو نظرانداز کرتے ہیں۔سیاسی مخالفین کو دبانے کی حوصلہ افزائی اور سیاسی تشدد کی درپردہ حمایت کرتے ہیں۔قوم پرستی،رجعت پسندی اور آمریت کے ایجنڈہ کو آگے بڑھانے کے لیے اقتدار کا استعمال ان کا شیوہ ہوجاتا ہے۔ہندوستان میں اس صورت حال کو موجودہ برسر اقتدار پارٹی سے جوڑا گیا ہے۔گزشتہ سال کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ۲۰۱۴ء سے ہندوستان میں جمہوریت کی سطح میں بہت زیادہ گراوٹ آئی ہے۔۲۰۱۳ء کے بالمقابل ۲۰۲۰ء میں 0.23 کی گراوٹ دیکھی گئی ہے۔۲۰۱۳ء میں جمہوریت کی سطح عروج 0.57 پر تھی جو کہ ۲۰۲۰ء میں گھٹ کر 0.34 پر رہ گئی۔(صحافی دکن،حیدرآباد ۹ مارچ ۲۲ء ص ۱) ک۔ص اصلاحی

کائنات میں ۴۴ لاکھ گیلکسیز کا مشاہدہ ہوا

سائنسدانوں نے کائنات (Universe) کا جو جدید ترین نقشہ بنایا ہے اس کے مطابق کائنات میں ۴۴ لاکھ گیلکسیز ہیں جن میں ایک گیلکسی ہماری اپنی بھی ہے جس میں زمین،سورج،چاند،ستارے وغیرہ شامل ہیں۔یہ تصور برطانیہ کی ڈرہم یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے طاقتور دوربینوں کے ذریعے حاصل کئے گئے ۳۵۰۰ گھنٹوں پر مشتمل مشاہدات کے مطالعے کی بنیاد پر تیار کیا ہے۔یہ مشاہدات آٹھ پیٹا بائٹ جگہ لیتے ہیں جس کو محفوظ کرنے کے لئے ۲۰ ہزار لیپ ٹاپ چاہئیں۔ان مشاہدات میں تقریباً دس لاکھ ایسے اجرام ہیں جن کا آج سے قبل مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔اب بھی سائنسدانوں کو پوری کائنات کا صحیح طریقے سے اندازہ نہیں ہوا ہے۔ (https://phys.org/news/2022-02-scientists-reveal-million-galaxies.html)

گیلکسی (galaxy) کائنات میں پائے جانے والا ایسا مجموعہ یا نظام ہے جس میں سیارے،سیارچے،گیس،دھول اور ڈارک میٹر مضبوطی سے ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں۔کچھ گیلکسیز میں چند ملین سیارے ہیں جب کہ زیادہ بڑی گیلکسیز میں ہزاروں ملین سیارے ہیں۔ہم اہل زمین ''نظام شمسی'' نام کی گیلکسی میں رہتے ہیں جو ''دودھ کا راستہ'' (Milky Way یا المجرة اللبنية) کا حصہ ہے۔اس کا مشاہدہ سب سے پہلے ابن الھیثم (۹۶۵۔۱۰۲۷ء) نے کیا تھا۔''دودھ کے راستے'' میں ۱۰۰ ہزار ملین سے لے کر ۴۰۰ ہزار ملین سیارے ہیں اور اس کا دائرہ ۸۲،۸۵۰ روشنی سالوں پر محیط ہے۔اصل کائنات اس سے بہت بڑی ہے جس کا ابھی تک مشاہدہ ہو پایا ہے۔یہی وہ لا متناہی کائنات ہے جس کے بارے میں اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ ساری دنیا کے سمندر اگر روشنائی بنادئے جائیں اور اتنی ہی روشنائی اور لائی جائے تو بھی اللہ پاک کی باتوں کا تذکرہ ختم نہیں ہوگا (الکھف:۱۰۹) (ظ۔ا۔خ)

وفیات

پروفیسر قاضی اشفاق احمد

پروفیسر قاضی اشفاق احمد، ریٹائرڈ پروفیسر انجینئرنگ اور تحریک اسلامی کے فعال کارکن کا انتقال ۱۰ ؍فروری ۲۰۲۲ کو سڈنی، اسٹریلیا میں ۹۱ سال کی عمر میں ہوا۔ وہ ۱۲؍دسمبر ۱۹۳۰ کو غازی پور کے ایک معروف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد مغلیہ زمانے میں قاضی کے عہدوں پر فائز تھے، انگریزوں کے زمانے میں وکالت سے جڑ گئے۔ بچپن میں والدین سے محروم ہو جانے کے بعد محمد آباد گہنہ اعظم گڑھ میں مقیم ان کے دادا اور پھوپھی نے ان کی پرورش کی۔ وہ تحریک آزادی میں شریک رہے اور مولانا آزاد، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ کام کیا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی ڈگری لینے کے بعد وہ سنہ ۱۹۵۹ میں امریکہ کی ویسکونسن یونیورسٹی پی ایچ ڈی کرنے گئے لیکن کسی وجہ سے پورا کئے بغیر واپس آگئے۔ بعد میں انھوں نے سڈنی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی پوری کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کچھ دن بہ حیثیت استاد گذارنے کے بعد ان کا تقرر ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر میں استاد اور ایکٹنگ پرنسپل کے طور سے ہوا۔ سنہ ۱۹۷۰ میں جب ان کو ایک سیاسی سازش کے تحت ملازمت سے برخواست کر دیا گیا تو وہ آسٹریلیا چلے گئے، جہاں ان کو عمدہ ملازمت اور قومی سطح پر عزت دی گئی۔ تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ انھوں نے آسٹریلیا کی مسلم کمیونٹی کی قیادت کی اور قرآنی تعلیمات کو وہاں عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ سماجی یکجہتی اور بین الادیان مکالمہ بھی ان کا ایک اہم میدان رہا۔ آسٹریلیا میں انہوں نے آسٹریلین اسلامک مشن، آسٹریلین فیڈریشن آف اسلامک کاؤنسل، اسلامک فیڈریشن آف ایجوکیشن اینڈ ویلفیر، ملٹی کلچرل عید فیسٹیول اینڈ فیئر، اسلامک فورم آف آسٹریلین مسلمز اور آسٹریلین مسلم ٹائمز (AMUST) کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ آسٹریلیا، ہندوستان، ملیشیا، برطانیہ، امریکہ اور سعودی عرب وغیرہ کی بہت سی کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ انہیں متعدد آسٹریلیائی اور بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا جس میں آرڈر آف آسٹریلیا (۲۰۲۰) شامل ہے۔ ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ اپنے ایک اہم فرد سے محروم ہو گئی۔ (ظ۔ا۔خ)

آثار علمیہ

اصلاح تمدن

علامہ شبلی کی نودریافت تقریر

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنفین
azmi408@gmail.com

علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷۔۱۹۱۴) سنہ ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد گئے اور سررشتہ علوم وفنون کے ناظم مقرر ہوئے۔غالباً فروری ۱۹۰۱ء میں انجمن اصلاح تمدن حیدرآباد جس کے سکریٹری ان کے ایک شاگرد مولوی عبدالحق (۱۸۷۰۔۱۹۶۱ء) تھے جو بعد میں ''بابائے اردو'' کے نام سے معروف ہوئے۔اس کا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں ممبران انجمن اور معززین شہر حیدرآباد شریک ہوئے۔اس میں شرکت کے لئے علامہ شبلی کو خاص طور پر مدعو کیا گیا اور صدارت بھی انہی کو تفویض کی گئی اور ان سے خواہش کی گئی کہ ''وہ انجمن کے مقاصد کے متعلق کچھ تقریر فرما کر انجمن کو عزت بخشیں''[۱]۔

جلسے کے آغاز میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اصلاح تمدن کے موضوع پر لکچر دیا جو ماہنامہ افسر حیدرآباد مارچ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا ہے۔اس ماہنامہ کے ایڈیٹر خود مولوی عبدالحق تھے۔ان کے علاوہ خواجہ غلام الثقلین (۱۸۷۲۔۱۹۱۵ء) مولوی نظام الدین حسن ،مولوی محب حسین سابق مدیر ماہنامہ افسر اور نواب ممتاز یار جنگ نے بھی اس جلسے میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔آخر میں علامہ شبلی نے خطاب کیا۔یہ تقریر علامہ کی تحریروں اور تقریروں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ابھی حال میں ان کے نودریافت خطبات کا ایک مجموعہ راقم حروف کی ترتیب وتحشیہ کے ساتھ دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے شائع کیا ہے۔یہ خطبہ اس میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

اس خطبے میں اصلاح تہذیب وتمدن کے ایک گوشہ شادی کے مواقع پر ہونے والی رسوم کی اصلاح کے

۱۔ماہنامہ افسر،حیدرآباد،مارچ ۱۹۰۱ء، ص ۱۳۷۔

موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے [۲]۔ تقریر حسب ذیل ہے:

سب سے اول میں آپ صاحبوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ آزردن دل دوستاں جہل است و کفارہ یمین سہل تو میں کبھی اس منصب کو قبول نہ کرتا اور نہ میں اس قابل تھا۔ جو مقاصد اس مجلس کے ہیں وہ مجھے اس رسالے سے جو نواب ممتاز یار جنگ بہادر نے مجھے عطا کیا تھا اور نیز اس تقریر سے جو معزز سکریٹری نے کی معلوم ہوئے۔ آپ کا مقصد بہت وسیع ہے۔ تمدن یا سویلیزیشن (Civilisation) کا ترجمہ یہاں ''تہذیب'' کیا گیا ہے لیکن مصر و شام میں اس کا ترجمہ ''مدنیت'' کیا جاتا ہے جو مناسب ہے۔ اور یہ لفظ نہایت وسیع ہے۔ ایک ایسے وسیع مسئلے کے متعلق میں اس وقت تقریر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ مگر صرف ایک شاخ کے متعلق جس پر انجمن نے اب تک بحث کی ہے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

آپ نے سر دست یہ قرار دیا ہے کہ شادی کے مراسم جو فضول اور لغو ہیں کم کر دئے جائیں لیکن سب سے پہلے یہ خیال کرنا چاہئے کہ دنیا میں جو رسم قائم ہوتی ہے اس کا سبب کیا ہوتا ہے اور یہ کہ اب بھی وہ سب باقی ہے یا نہیں ہے۔

کوئی رسم خواہ کیسی ہی بدتر کیوں نہ ہو جب قائم ہوتی ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی علت یا نیچرل اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ اسی طرح شادی کے رسوم جو اس وقت بے معنی اور لغو معلوم ہوتے ہیں ان کا بھی کوئی سبب تھا۔

شادی ایک قسم کا معاہدہ ہے، جس کا اعلان ہونا ضروری ہے تاکہ تمام لوگ اس سے واقف ہو جائیں۔ اور اگر مابین زن و شوہر کوئی تکرار یا جھگڑا واقع ہو تو اس کا ثبوت پیش ہو سکے۔ غرض یہ معاہدہ آیندہ زندگی پر قوی اثر رکھتا ہے۔ اور اس لئے اس کے واسطے اعلان کی ضرورت داعی ہوئی۔ شریعت اسلام نے شادی کے متعلق سب کچھ گھٹایا مگر اس قدر ضرور اجازت دی کہ دُف بجایا جائے حالانکہ یوں باجا بجانا منع ہے۔ اسی طرح کم سے کم دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ نکاح ناجائز ہے۔ بلکہ (بعض کا یہاں تک خیال ہے) کہ عدم موجودگی گواہوں سے نکاح نہ صرف پبلک کی نگاہ میں بلکہ خدا کے ہاں بھی ناجائز ہے۔ درحقیقت باجا بجانا اور گواہوں کا ہونا ایک قسم کا اشتہار ہے۔ اُس زمانہ میں نہ رجسٹری کا قاعدہ تھا نہ اخبار تھے۔ آخر اعلان کیوں کر ہوتا۔ اس واسطے یہ قواعد مقرر کئے گئے تاکہ جو فائدہ رجسٹری سے حاصل ہے وہ اس سے پیدا ہو۔ اب جہاں رجسٹری کا قاعدہ جاری ہے وہاں اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

۲۔ یہ تقریر اس زمانے کے حالات کی عکاس ہے۔ آج حالات بدل چکے ہیں، خاندان اور معاشرے میں عورت کی پوزیشن بھی بدل رہی ہے، نیز مسلمانوں کی فضول خرچیوں کی وجہ بھی بدل گئی ہے (ایڈیٹر)۔

دوسری چیز طلب ناموری اور شہرت ہے۔درحقیقت یہ جان انسانیت ہے۔اور ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ہے۔دنیا کی ترقی کی اعلیٰ وجہ بھی طلبِ شہرت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شہرت کیوں کر حاصل کرنی چاہئے۔ایک مہذب اور غیر مہذب ملک میں فرق یہ ہے کہ ایک کے ہاں صحیح اور جائز طریقے شہرت حاصل کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور دوسرے کے ہاں ناجائز، مگر طلبِ شہرت میں دونوں مشترک ہیں۔ مثلاً آج کل یورپ اور امریکہ کے لوگ کار خیر میں ہزاروں اور لاکھوں روپیہ دے دیتے ہیں۔ مگر ہندوستان کا ایک بنیا جو دولت مند ہے وہ شادی کی تقریب میں لاکھوں صرف کر دیتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ میری ناموری کا یہی ذریعہ ہے۔یہ شادی کی رسمیں اس وقت کی قائم کی ہوئی ہیں جب کہ شہرت کے ذرائع اس سے بہتر اور اعلیٰ نہ تھے۔

تیسرا سبب مخصوص ہندوستان سے متعلق ہے اور شاید اور ملکوں میں بھی ہو۔یعنی لڑکی کا ساتھ لے جانا۔ہندوستان میں بیٹی دینا عار سمجھتے تھے اور خوشی سے شادی نہیں کرتے تھے۔دولہن کا اس طرح لے جانا اس امر پر مبنی تھا کہ گویا لڑکی کو بزور لے جانا ہے۔رفتہ رفتہ یہ رہ گیا کہ کہ گھوڑے، ہاتھی، پالکی، اور دیگر شان وشوکت کے ساتھ لڑکی رخصت ہونے لگی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسباب اب بھی موجود ہیں یا نہیں۔ جاڑوں کے کپڑے گرمیوں میں موزوں نہیں ہو سکتے۔اگر وہ اسباب موجود نہیں ہیں تو پھر ان چیزوں کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے؟ اعلان اب بھی ضروری ہے اور جو کچھ شرع شریف نے اس کے متعلق بتایا ہے وہ بالکل کافی ہے۔دُف یا باجا بجانا اور گواہوں کا ہونا۔اب رہا ذریعۂ شہرت، تو اس قسم کی تقریبیں اس کے لئے اب بالکل بیہودہ سمجھی جاتی ہیں اور جوں جوں تہذیب بڑھتی جائے گی یہ چیزیں مٹتی جائیں گی۔ لیکن ایک امر سب سے ضروری ہے اور جس کی طرف میں آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کیسی ہی انجمنیں قائم کیجئے آپ کو کافی طور سے کامیابی نہیں ہو سکتی۔اس رسم میں بڑا حصہ عورتوں کا ہے۔ سیکڑوں کو یہ تسلیم ہے کہ بہت سی رسوم لغو اور فضول ہیں اور ترک کر دینی چاہئیں، مگر وہ عورتوں کی حکومت سے آزاد نہیں ہو سکتے۔اب سوچنا چاہئے کہ ہم کیونکر اس حکومت سے آزاد ہو سکتے ہیں۔میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ عورتیں اس قابل نہیں اور ان سے یہ حکومت چھین لی جائے۔ ہم نے عورتوں کے بہت سے حقوق برباد کئے ہیں اور ان کی تلافی میں صرف یہ حکومت باقی رہ گئی ہے۔ہم اس سے بہ آسانی آزاد ہو سکتے ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو سمجھائیں اور تعلیم دیں کہ جائز ذریعۂ شہرت یہ نہیں ہے اور دوسرے ذرائع شہرت کے انہیں بتائے جائیں۔یہ ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنی ناموری چاہتا ہے۔ہماری عورتیں سرکاری عہدوں پر نہیں۔تالیف وتصنیف کا کام نہیں کرتیں اور نہ کسی قسم کا کام ان کے ہاتھ میں ہے جس سے ناموری حاصل کریں۔ تو پھر ان کے پاس کون سی ایسی چیز ہے جو ان کے حوصلے اور خدمات کو دکھا سکے۔ان کے پاس صرف ایک یہی میدان رہ گیا ہے۔بچہ کے پیدا ہوتے ہی یہ خیال آٹھ پہر ان

کے سامنے رہتا ہے کہ اس کی شادی دھوم دھام سے کریں۔ جب یہ مسلم ہے کہ عورتوں کے لئے سوائے اس میدان کے اور کچھ باقی نہیں ہے تو ہمیں چاہئے کہ ایسے ذرائع پیدا کریں کہ وہ اپنے حوصلے دکھا سکیں اور پھر یہ سب چھوٹ جائے گا۔ میرے خیال میں کسی کا قید رہنا آسان ہے، مگر یہ کہنا کہ صبح سے شام تک ایک جگہ بند رہو اور کچھ نہ کرو، بہت مشکل ہے۔ ہماری عورتوں کے لئے اب کیا شغل ہے، سوائے اس کہ بچے کی شادی کے سامان کریں اور اسی ارمان میں اپنی زندگی بسر کریں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ رسوم مٹ جائیں تو مردوں کی کوشش سے یہ کام سرانجام نہیں پاسکتا جب تک عورتوں کو تعلیم نہ دی جائے اور وہ خود اپنی اصلاح نہ کریں۔

اخیر میں، میں اس قدر اور کہوں گا کہ ہندوستان میں اصلاح کے لئے سیکڑوں انجمنیں قائم ہیں، لیکن قریباً سب ناکام ہیں۔ اس لئے کسی انجمن کا نام سنتے ہی سب سے اول یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک لطف صحبت کے لئے ہے، اس لئے میں بقول ایک عرب کے یہ کہتا ہوں : کن یداً ولا تکن لساناً۔ لوگ کہتے بہت کچھ ہیں، مگر اتنا کر نہیں سکتے۔ عرب شاعر کہتا ہے کہ زبان نہ بنو بلکہ ہاتھ بنو۔

اب میں اس کے متعلق اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں کچھ کر کے دکھانا چاہئے۔ اگر ہر شخص عملی صورت بن جائے تو لوگ دیکھ دیکھ کر اس سے زیادہ متاثر ہوں گے۔ انسان جس قدر آنکھ سے سیکھتا ہے کان سے نہیں سیکھتا۔ اسراف بہت بری چیز ہے۔ اسے روکنا چاہئے۔ اور وہ ہم میں ہی نہیں بلکہ انگریزوں میں بھی ہے، جن کی ہم تقلید کرتے ہیں۔ اس لئے جب ہم نمونہ بننا چاہتے ہیں تو ایسا بننا چاہئے کہ کسی گروہ یا فرقہ کا اسراف ہم پر عاید نہ ہو (ماہنامہ افسر، حیدرآباد مارچ ۱۹۰۱ء، ص ۱۳۷۔ ۱۴۲۔)

باب التقریظ والانتقاد

رسائل کے خاص نمبر

سہ ماہی مجلہ المجیب، عمدۃ المتوکلین نمبر، مدیر ڈاکٹر فتح اللہ قادری، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۵۶۴، زر سالانہ ۲۵۰ روپے، خاص شمارہ ۵۰۰ روپے، پتہ: ایڈیٹر المجیب، دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار۔ موبائل نمبر ۷۲۵۰۴۳۳۵۶۲۔
almujeebquarterly@gmail.com

کئی سال ہوگئے، اردو رسائل و جرائد کے خاص شماروں اور بعض نئے رسالوں کا تعارف معارف میں نہیں آسکا، کورونا کی وبا اور بلا نے بے شمار انسانوں اور اداروں کی طرح رسالوں کے وجود کو بھی بری طرح متاثر کیا، تاہم زندگی کا تکوینی نظام بہر حال جاری ہے، کچھ فرصت و راحت ملی تو اردو رسالوں نے روایتوں کے سلسلہ کو پھر سے زندہ کرنے اور رکھنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں چند شخصیتوں کی یاد میں اہم شمارے سامنے آگئے، ان میں بعض اہم نمبروں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ نئے رسالوں کا تعارف بھی اس باب میں ہوتا تھا۔ کوشش ہوگی کہ ان کا بھی ذکر آجائے۔ ہمارے سامنے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے قدیم اور موقر دینی، علمی و ادبی مجلہ المجیب کا عمدۃ المتوکلین نمبر ہے، مولانا شاہ ہلال احمد قادری کی وفات اگست ۲۰۲۰ء میں ہوئی، ترسٹھ سال کی عمر میں دنیا سے جاتے جاتے ایک اور سنت پر عمل کر گئے اور یہ گویا اعلان بھی تھا کہ کائنات کی سب سے برتر و برگزیدہ ہستی کی محبت و اطاعت اور پیروی میں ساری زندگی گزری، موت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکی، ان کے انتقال کے وقت مولانا مناظر احسن گیلانی کے یہ الفاظ سامنے آگئے تھے کہ خانقاہ مجیبیہ سے جو رہ قلندر نکلی وہ دراصل 'مصطفی برساں خویش کہ دیں ہمہ اوست' سے پھوٹی ہوئی کرن ہے، ہلال مرحوم اس قول کی بڑی سچی تعبیر تھے، خانقاہ کی وراثت میں شریعت و معرفت و حکمت کی ثروت سے عبارت ہے، علمی لحاظ سے وہ مصنف و محقق اعلیٰ درجہ کے تھے اور خطابت اور اصلاح و تزکیہ نفس میں بھی ان کا وہی درجہ تھا اور ان دونوں نعمتوں کے ساتھ اخلاق حسنہ کا وہ دلکش ترین مجسمہ تھے، خانقاہ مجیبیہ کی روایات میں شخصیتوں کی امتیازی خوبیوں کے اظہار کے لیے القاب کا انتخاب بھی ہے، تاج العارفین، فیاض المسلمین، امام المتقین، امان المستجیرین، بدر الکاملین وغیرہ القاب و خطابات اس خانوادہ کی تاریخ کے عنوان بن جاتے ہیں، مولانا ہلال احمد مرحوم کی خاکساری، سادگی، فروتنی اور انکسار کا شاہد ان کا ہر زائر و ملاقاتی ہے مگر عہد طفلی میں یتیمی کا داغ اٹھانے والے بچے کے درد کو صرف اہل خانہ ہی سمجھ سکتے ہیں، خود ان کی بیٹی کا یہ بیان ہے کہ ''اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آپ نے صدمات اور مصائب کے کتنے دریا عبور کیے ہیں'' عمدۃ المتوکلین ان کو یوں ہی نہیں کہا اور سمجھا گیا، قادری مرحوم کی تحقیقی صلاحیت بھی کمال کی تھی اور اس کے ساتھ تحریر کی شگفتگی، سلاست اور دلکشی و جاذبیت میں بھی ان کی انفرادیت ان کے ساتھ رہی، ان کے متعلق یہ کہنا بھی

مبالغہ نہیں کہ وہ آسمان علم و عرفان کے نیر تاباں تھے، المجیب نے ان کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر عمدہ اور مفید مضامین کو یکجا کیا، یہ عمل ادائے فرض کے درجہ کا ہے اور جس سلیقہ سے مختلف ابواب کی سرخیاں قائم کی گئیں وہ بھی داد کے لائق ہے، جیسے نقوش حیات اہل تصوف کی نگاہ میں، امتیازات و خصوصیات، اوصاف و کمالات، احوال و آثار، تالیفات و تصنیفات، مکاتیب و پیغامات تعزیت، قطعات تاریخ، گوشہ کلام عمدۃ المتوکلین وغیرہ، حضرت عمدۃ المتوکلین کی ایک تحریر ان ہی کے خط میں سرورق پر دی گئی ہے اور یہی ان کی شخصیت اور ان کے فہم و فکر کی سچی تصویر بھی ہے، چند جملے اس طرح ہیں "۔۔۔۔۔واضح رہے کہ مذہب و مسلک کے لیے عصبیت کا ہونا لازمی ہے، بغیر حمیت و عصبیت کے کوئی مسلک و مذہب اپنی اصل ہیئت پر باقی نہیں رہ سکتا اور اس کے ماننے والے اپنے افکار و نظریات کو محفوظ نہیں رکھ سکتے مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔۔۔۔۔دوسری طرف مذہبی رواداری اتحاد ملی کے لیے ضروری ہے۔۔۔۔۔مشائخ اس پر غور فرمائیں کہ دوسرے مسالک و مذاہب کے متبعین سے کس حد تک راہ و رسم مناسب ہے ۔۔۔۔ضرورت ہے کہ محل اختلاف کو نظر انداز کر کے اتحاد کے وہ نکتے تلاش کیے جائیں جن پر سب کا اتفاق ہو۔

سربراہی انتساب عالمی محمد خلیل نمبر، مدیر جناب آفاق سیفی، مرتب: ڈاکٹر سیفی سرونجی، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۱۲، قیمت سالانہ ۴۰۰ روپے، خاص شمارہ کی قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: سیفی لائبریری سرونج ایم، پی-۴۶۴۲۲۸۔ای میل:saifisironji2ois@gmail.com اور sruti9575@gmail.com۔

مدھیہ پردیش کے تاریخی قصبہ بلکہ شہر سرونج کو علمی و ادبی دنیا کے نقشہ پر نمایاں مقام عطا کرنے میں رسالہ انتساب اور اس کے بانی و مدیر جناب سیفی سرونجی کا کردار ناقابل فراموش ہے، اس رسالے نے خاص نمبروں کی اشاعت میں بھی ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا، پچیس سے زیادہ ادیبوں اور شاعروں پر یہ شمارے، ہر حلقے میں قدر کی نظر سے دیکھے گئے، جن شخصیتوں سے ان شماروں کا انتساب ہوا، ان میں کچھ تو شہرت کی بلندیوں پر تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے کارناموں سے تو شہرت و مقبولیت کے حقدار تھے لیکن وہ خود شاید اس شہرت سے بیزار تھے، زیر نظر خاص شمارہ بھی ایک ایسی شخصیت کے لیے وقف کیا گیا ہے جو نثر، شعر اور تنقید کے کاروبار سے دور، سائنس کی وادیوں میں مضامین نو کے انبار لگاتے رہے، وہ ایک موقر سائنسی ادارہ (نسکیر) سے ریٹائر ہوئے، سائنس کی تدریس سے بھی وابستہ رہے لیکن جس کارنامہ نے انتساب کو ان کی شخصیتوں کے اجالوں کو سمیٹنے اور بکھیرنے کا جذبہ دیا وہ ان کے سائنسی مضامین ہیں جو ایک ہزار سے بھی زیادہ ہیں، اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی ہیں، بچوں اور خواتین کا سائنسی ادب خاص طور پر ان کے پیش نظر رہا، رسالہ سائنس کی دنیا کے وہ مدیر بھی رہے، انتساب کے مرتب نے لکھا کہ خلیل صاحب چالیس برسوں سے تنہا اور بغیر کسی گروپ میں شامل ہوئے بس خاموشی اور انہماک سے اردو ادب کو سائنسی موضوعات سے مالامال کرتے رہے، ساہتیہ اکیڈمی نے ان کو انعام دیا، پھر بھی وہ گمنام سے رہے یا نام بھی ملا تو وہ نام

والوں تک ہی محدود رہا، انتساب نے ان پر مضامین کو یکجا کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ سو سے زیادہ سائنس داں، سیاست داں، شاعر، ادیب اور نقاد ان کی عظمت کا اعتراف کر چکے ہیں، خلیل صاحب کے قلم سے چودہ سائنسی کتابیں نکلیں، اس لیے عوامی شہرت کے ہونے نہ ہونے کا شکوہ ہو سکتا ہے لیکن مقبولیت کی نعمت یقیناً شکر کا تقاضہ کرتی ہے، اس تقاضے کو انتساب نے واقعی بڑی خوبی سے پورا کیا ہے اور ایک ایسی ہستی سے عام اردو والوں کو متعارف کرایا جس کی سوچ یہ تھی کہ چونکہ اردو والوں کے پاس سائنسی مزاج اور سوچ جیسی چیزیں مفقود ہیں اس لیے سائنس کا نئی نسل سے جوڑنا زیادہ مناسب ہے، جون پور، گورکھ پور اور علی گڑھ اور پھر دہلی، ان مقامات کا اگر سائنسی تجزیہ کیا جائے تو اس کے لیے سب سے بہترین وجود خلیل صاحب ہی کا ہوگا، اگر یہ کہا گیا کہ وہ عجز وانکسار کا ایسا نمونہ ہیں جو اپنی اچھائیوں کو بھی کوتاہیوں کے طور پر پیش کرتے ہیں، انتساب نے واقعی کمال کیا کہ اردو زبان و ادب سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں اصحاب قلم کی تحریروں کو جمع کر کے ایک نئے گلستان خلیل کا نظارہ کرادیا اور پروفیسر عبدالحق کے قلم سے خود انتساب کا یوں تعارف کرادیا کہ: چراغ حاضر دانش بکف ہے ذکر خلیل، خلیل صاحب کی شخصیت اور ان کے مزاج وفکر سے واقف ہونے میں لذت بھی ہے اور افادیت بھی، اس کے لیے یہ خاص نمبر خود اپنے مطالعہ کا پر زور دعویٰ کرتا ہے۔

ششماہی دستک جنوری تا جون ۲۰۲۱ء، کبیر نمبر، مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۱۰، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: شعبہ اردو فیکلٹی آف آرٹس، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی- ۲۲۱۰۰۵، موبائل: ۹۴۵۰۵۲۷۷۳۳، dastakurdubhu@gmail.com:

بنارس ہندو یونیورسٹی کا شعبہ اردو کا ماضی اردو کے کئی نامور محققوں، ادیبوں اور نقادوں کی وجہ سے قابل فخر رہا، اور اب بھی سنجیدہ مطالعہ و تحقیق اور فعال و متحرک اساتذہ کی بدولت اس روایت پارینہ کی زندگی اور تابندگی میں زیادہ فرق نہیں آیا، اس کی بڑی مثال شعبہ کا جریدہ دستک ہے جو معیاری، تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ اہم شخصیتوں کے حالات پر مشتمل گوشوں کے لیے بھی اہل نظر کی نظروں میں خاص جگہ بنا چکا ہے، قاضی عبدالودود، عبدالرحمن بجنوری، مہدی افادی جیسے ناموروں پر یہ شمارے بڑی اہمیت وافادیت کے حامل ہیں، ان خوبیوں کے لیے صدر شعبہ اردو پروفیسر آفتاب احمد آفاقی بجا طور پر مستحق تبریک ہیں، اب دستک کے تازہ شمارہ کو انہوں نے کبیر داس کے لیے وقف کیا ہے، کبیر کی شاعری، فقیری، تعلیمات، روحانی معاشرہ، نئی روایت مسلم قدامت پرستی، تہذیبی اثرات، شعری جہات، وحدت حقیقت ومجاز کے ساتھ امیر خسرو، نظیر اکبرآبادی اور جوش جیسے شاعروں کی آوازوں میں کبیر کے آہنگ کی تلاش جیسے مباحث پر تیس کے قریب مضامین ہیں، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، منوہر لال زتشی، تاراچند، جعفری، جالبی، بلجیت سنگھ، رام کمار ورما، نامور سنگھ جیسے ناموروں کے مضامین کا انتخاب، فاضل مدیر کے وسیع مطالعہ کے ساتھ ان کے حسن ذوق اور ان کی نگہ انتخاب کی گہرائی کا بھی بیان ہے، کبیر کو جاننے کے لیے اور ان کی روح سے آشنا ہونے کے لیے اگر کسی قاری کو اس خاص نمبر کی ہم نشینی مل جائے تو شاید کہیں اور دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہے،

زتشی جب یہ کہتے ہیں کہ کبیر بھکت تھے، شاعر نہیں تھے تو اس اجمال کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ شاعری، شاعری کے واسطے نہیں کرتے تھے، شاعری ان کا ذریعہ اظہار اس لیے ہوئی کہ قدرت سے شاعرانہ صلاحیت ان کو ودیعت ہوئی تھی، فن شاعری سے ان کو کوئی حس نہیں تھا، کبیر کی طرح ان کی شاعری کھری ہی رہی، تاراچند کا مضمون تو گویا شاہکار ہے، اس مضمون میں اس کبیر کی دریافت ہے جس نے زندگی کے رازہائے سربستہ اور اس کے ناقابل بیان روشنی کے جلوے دیکھے، کبیر کی شاعری کے ساتھ ان کی زبان پر بھی اعلیٰ درجہ کی بحث آگئی ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر سے کبھی ایک رسالہ جواہر الاسرار نام کا گزرا، اس میں کبیر اور کچھ بیراگیوں کی گفتگو نقل کی گئی ہے، سید صاحب نے کبیر کے سال وفات کی روشنی میں سوال کیا کہ یہ گفتگو کیا سولہویں صدی کی ہندوستانی بولی ہے، اگر ہے تو کبیر کی شاعری کی زبان بہت آسان ہے اور اس میں عربی وفارسی کے بگڑے ہوئے الفاظ بہت ہیں، البتہ سید صاحب کی اس تحریر میں ایک جگہ (۱۳۳۸ھ مطابق ۱۷۲۰ء) لکھا ہوا ہے، یہ مطابقت ظاہر ہے درست نہیں، یہ کتابت کے سہو کو درست ہونا چاہیے، پروفیسر آفاقی نے بھی پرزور انداز میں یہی خیال ظاہر کیا کہ کبیر بنیادی طور پر ریختہ کے شاعر ہیں، ان کو اعتراف ہے کہ خسرو کو اردو ادب کی تاریخ میں پہلا باضابطہ ریختہ یا ہندوی کا شاعر بتایا جاتا ہے لیکن ملال اس بات کا ہے کہ کبیر کے ریختہ گوہر ہونے کے باوجود ان کو اردو تحقیق وتنقید کا حوالہ نہیں بنایا گیا، فاضل مدیر نے خسرو اور ولی دکنی کے درمیان اردو کے آغاز وارتقا کے سفر کا مشاہدہ کرنے والے اردو مورخین کی کبیر فراموشی پر حیرت کا اظہار کیا ہے اور جن دلائل کا سہارا لے کر بتایا ہے کہ مشرقی ہندوستان میں زبانوں کے اختلاط سے جس نئی زبان کو وجود ملا اور جو پورے شمالی ہندوستان کو محیط ہوا، اسی وجود کو ہندی، ریختہ اور اردو کہا گیا، شاید اسی وجہ سے تاراچند جیسے مورخ نے کبیر کو ریختہ کا شاعر قرار دیا، فاضل مدیر کے عالمانہ اداریہ نے باقی مضامین کے مطالعہ کا ایک رخ متعین کر دیا اور یہی کسی خاص شمارہ کے حرف آغاز کی کامیابی ہے، یہی نہیں نئے لکھنے والوں نے بھی مطالعہ وتجزیہ میں ایماندارانہ رویہ اختیار کیا، اس طرح یہ خاص شمارہ متقدمین ومتاخرین کے ذہن ومزاج کے فرق اور ان کے مطالعہ اور تجزیہ کے زاویوں کا فرق بھی واضح کرتا ہے۔

ششماہی غالب نامہ، شمیم حنفی نمبر، مدیراعلیٰ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، عمدہ کاغذوطباعت، صفحات ۵۰۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی-۲، موبائل نمبر ۲۳۲۳۲۵۸۳، ای میل: ghalibinstitute@gmail.com

غالب نامہ کا شمیم حنفی نمبر بھی اصلاً کورونا کے دیے ہوئے ان زخموں کی نمائش ہے جن سے کورونا کے بعد کے اردو خاص نمبر لہو رنگ نظر آئے۔ شمیم حنفی اردو کے واحد یا صف اول میں شامل نقادوں کی دنیا سے کچھ دور رہے ہوں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ کہ معاصر تنقیدی رویوں سے گھرے ہونے اور ایک شورانگیز ماحول میں اپنی آواز کے آہنگ کو کم ہوتے دیکھنے کے آزار کو سہنے کے باوجود وہ اپنی جداشناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے اور

شاید اس کی وجہ ان کے وسیع مطالعہ اور اس سے بھی زیادہ مطالعہ کے نتائج پیش کرنے میں ان کے قلم کی نہ رکنے والی اور نہ تھکنے والی رفتار تھی، جنھوں نے ان کو بہت قریب سے دیکھا یا پرکھا، ان کی زبان کہتی رہی کہ شمیم حنفی نے ایسی ادبی زبان وضع کی جس کا آہنگ تخلیقی ہونے کی وجہ سے اور تنقیدی دبستانون سے الگ رہا اور ایک فاصلہ بھی رکھنے کا اعلان کرتا رہا، اسلوب میں خوش گواری، انفرادی پہچان بن گئی تو یہ محض رسمی اور تاثراتی الفاظ کا روایتی استعمال نہیں، شمیم حنفی کے ناقدانہ مقام ان کی نثر کی درجہ بندی جیسے کام ہوتے رہیں گے لیکن خدا جانے بعد میں یہ کہا جائے گا یا پھر کسی خاموشی کی چادر میں یہ الفاظ کو لپیٹ دیے جائیں گے کہ شمیم حنفی کا مطالعہ جس قدر وسیع ہوتا گیا، اسی قدر ان پر خاموشی طاری ہوتی گئی، ہم عصر نقادوں کو دیکھنے والوں کو کیوں حنفی صاحب کا نمایاں خاصہ وہ عفو ودر گزر نظر آیا جس کے اثر سے وہ کلیوں اور دعووں کی آلودگی سے اپنی تحریر کو بچاتے رہے، اس خاص شمارے میں قریب پچاس تحریریں ہیں، اعلیٰ وبلند پایہ اور بعض کسی درجہ کمتر، تاثراتی زیادہ، تجزیاتی اور تحلیلی کم، اور یہ کمی نقص نہیں یادگاری شماروں میں خالص فنی مباحث کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے، مگر غالب نامہ جیسے تحقیقی وتنقیدی مجلہ کی پیشکش خود اپنا ایک مقام رکھتی ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ خاص نمبر واقعی خاص اہمیت کا حامل ہو گیا، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ندوی نے ثاقب فریدی تک ہر مضمون قاری کی دنیا کو زندہ وآباد رکھنے میں موثر بن جاتا ہے، اداریہ ہی میں یہ جملے دیر تک ذہن کی فضا میں تیرتے رہتے ہیں کہ شمیم حنفی نے ادب کو اپنی سانسوں میں اتار لیا تھا، ادب اور ذات کی تفریق ان کے یہاں مٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، یہ دعویٰ گرچہ ہے بہت بڑا اور نازک بھی مگر خود کو تسلیم کراتا بھی نظر آتا ہے کہ وہ ادب کو جس وسیع تناظر میں دیکھتے تھے اس کی مثال کیا رفتہ کیا موجود ہر دور میں خال خال نظر آتی ہے، مرتب سرور الہدیٰ نے البتہ شمیم حنفی کے ادبی مطالعوں میں خیال کی مسافت تلاش کی اور اس مسافت کو انھوں نے عمر بھر تازہ دم رکھنے کی وجہ بھی بنا دی، اس ذرا مشکل سے سمجھ میں آنے والی وجہ کا مطلب یوں بتایا گیا کہ تازہ دم رہنے کا مطلب آگہی کا وہ عذاب ہے جو ہر حساس اور صاحب نظر ادیب کے لیے پریشانی کا سبب رہا ہے، فاضل مرتب کے یہ خیالات غور وفکر ہی نہیں بحث ومباحثہ کا در بھی کھول سکتے ہیں لیکن ت حسین فراقی کی اس بات پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی کہ شمیم حنفی نے تنقید کو تہذیب بنا دیا، وہ عہد حاضر میں انسان کی بے وقعتی اور عالمی آشوب پر دل گرفتہ رہتے تھے، علم ودانش کا حاصل تو یہی دل گرفتگی ہے اور یہی تنقید کے جلال اور تخلیقی شعور کے جمال کا سبب بن جاتا ہے، غالب نامہ نے شمیم شناسی کا حق ادا کر دیا، اس خاص شمارے سے شمیم حنفی ان کے بھی قریب ہو گئے جو ان سے بہت دور تھے۔

سہ ماہی مطالعات، پروفیسر لیسین مظہر صدیقی نمبر، مدیر ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۴۶، قیمت سالانہ ۵۰۰ روپے، خاص نمبر کی قیمت ۵۰۰ روپے، پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز-۱۶۲، جوگا بائی، مین روڈ، نئی دہلی-۲۵، فون: ۲۶۹۸۱۱۸۷، ای میل:
ios-newdelhi@gmail.com

سہ ماہی رسالہ مطالعات، مشہور صاحب قلم پروفیسر محسن عثمانی کی ادارت میں ایک عرصے سے علمی وفکری

اور ادبی مضامین کی روایت کو عام کرتا رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کی قدر و قیمت میں فاضل مدیر اور ان کے نوجوان معاونوں کی محنت ہر شمارہ میں صاف نظر آتی ہے۔ زیر نظر شمارہ بھی اتفاق سے سلسلہ کشتگان کرونا کا حصہ ہے۔ پروفیسر یسین مظہر صدیقی بھی بر صغیر کو بخشی گئی نعمتوں کا وہ مظہر تھے جس کے لیے اعلیٰ دینی و تحقیقی ادب پر اظہار شکر واجب ہوتا ہے۔ وہ رخصت ہو گئے لیکن ان کی خوبیاں ان کے ہم عصروں اور شاگردوں اور ان کی بلند پایہ تحریروں سے فیض اٹھانے والوں کے لیے ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ زیر نظر شمارہ کی ساری تحریر اسی احساس کی تفسیریں ہیں۔ یہ قریب تیس مضامین ہیں۔ شخصی نقوش، علمی خدمات ، مراکز علم سے وابستگی جیسے عنوانات ہیں ۔ چند مضامین بطور ضمیمہ کے ہیں ۔ بڑوں میں مولانا سید محمد رابع ندوی، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی، محمد حامد انصاری اور مولانا سید جلال الدین عمری جیسی اہم شخصیتوں کے تاثرات ہیں تو پروفیسر طارق منصور، پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، جناب تابش مہدی جیسے ہم رتبہ بھی ہیں۔ ہم نفسوں میں ان کے کئی عزیزوں جیسے شاگردوں کی تحریریں، مرتبہ و منزلت شناسی کی عمدہ مثالوں کی شکل میں ہیں اور ایک باکمال، سراپا عمل شخصیت کی جلوہ نمائی کے ثواب میں شریک ہیں۔ پروفیسر صدیقی مرحوم کی علمی زندگی ایک خط مستقیم تھی جس کا سرا تاریخ تو دوسرا سیرت نگاری سے عبارت ہے۔ تاریخ سے ابتدائی شغف نے ان کو تاریخ کی سب سے بڑی سچائی سیرت نگاری تک پہنچا دیا اور قریب سو سال بعد اپنے کارناموں سے اسی شخصیت کی یاد بھی تازہ کرا گیا۔ جس کی ابتدا تاریخ اور جس کا خاتمہ بالخیر سیرت نگاری پر ہوا تھا۔ اسی لیے بعض تحریروں میں ان کو یادگار شبلی و سلیمان بجا طور پر کہا گیا اور کئی عمدہ مضامین اسی پہلو سے آ بھی گئے۔ سیرت نگاری کی ایک بڑا فائدہ قرآنیات سے تعلق کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی اور ڈاکٹر اشہد رفیق ندوی کے مضامین سے یہ گوشہ بھی خوب روشن ہوا۔ شاہ ولی اللہ کے فکر و فلسفہ کے تعلق سے البتہ کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے ۔ شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل کے ذریعہ انہوں نے شاہ صاحب کی کتابوں اور ان کے نظریات کو جس طرح عام کیا، یہ خود ایک کارنامہ ہے۔ مضامین سب اچھے ہیں۔ سطح کے لحاظ سے بھی اور گہرائی کے لحاظ سے بھی۔ شخصیت کے اندرون کے جائزے اور مشاہدے کے لیے ڈاکٹر جمشید احمد ندوی کا مضمون اس رسالہ کی جان ہے۔ کچھ قریب سے دیکھنے والے بھی اس تحریر کو پڑھ کر اعتراف کر سکتے ہیں کہ

ع: اصغر سے ملے لیکن اصغر کو نہیں دیکھا، ہاں مدیر رسالہ کی تحریر کا نہ ہونا، ان کے قارئین کے لیے تشنگی کا احساس بڑھا جاتا ہے۔ تاہم وہ اور ان کے معاونین اس وقیع شمارہ کو اشاعت کے لیے یقیناً شکر کا حق رکھتے ہیں۔ ع۔ ص

تبصرۂ کتب

عشرت گیاوی حیات و شاعری:ڈاکٹر سید شاہد اقبال۔کاغذ طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش ،صفحات ۳۳۶۔پتہ: مصنف آستانۂ حق ،روڈ نمبر ۱۰(ویسٹ بلاک)نیو کریم گنج ،گیا،۸۲۳۰۰۱۔ قیمت:۱۹۴روپے۔سن طباعت:۲۰۱۹ءموبائل نمبر:۔۹۴۳۰۰۹۲۹۳۰

عشرت ایک متمول خانوادہ کے چشم وچراغ تھے۔ان کی پیدائش ۱۸۶۰ءاور وفات ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔فطرۃ شاعر تھے۔بعد میں تلمیذ غالب شوخی رامپوری کے تلمذ نے ان کی شاعرانہ لیاقت میں چار چاند لگادیا۔عام خیال یہ ہے کہ زمانہ کی ناقدری کے سبب عشرت گیاوی گوشۂ گمنامی میں رہے۔اب ان کے ہم وطن محقق ڈاکٹر سید شاہد اقبال نے ان کے حالات قلم بند کرکے شعر وادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔زیر تبصرہ کتاب میں ص۸ سے ۹۰ تک معصوم عزیز کاظمی صاحب کا طویل اور معلومات افزا مقدمہ ہے۔اس کے بعد پیش گفتار میں لکھا گیاہے کہ شمیم عشرت اور صدکان گہر جیسی گراں قدر تصنیفات کے منظر عام پر آنے کے باوجود عشرت کی حیات اور شاعری پر اب تک کسی نے توجہ نہیں دی ہے (ص۹۲)اہل علم کی ناقدری اور بے توجہی اس کتاب کی وجہ تصنیف بھی بتائی گئی ہے۔گویا عشرت پر یہ پہلا اور گراں قدر تحقیقی کام ہے۔کتاب کے مواد کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیاہے۔پہلا باب حالات عشرت گیاوی کا مطالعہ تین جلی عنوانات عشرت گیاوی کے حالات زندگی، عشرت گیاوی رسالوں، کتابوں اور تذکروں میں ، عشرت گیاوی کے چند اہم معاصرین اور دوسرا باب عشرت گیاوی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ کے عنوان سے ہے۔ اس میں غزلیات، رباعیات، دیگر اصناف شاعری میں عشرت گیاوی کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے حاصل کلام کے تحت مرقوم ہے کہ عشرت کے تمام شعری سرمایہ پر اجمالی نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتاہے کہ ان کی طبیعت نظم گوئی کی طرف مائل نہ تھی۔(ص۲۳۶) باب سوم ''انتخاب کلام عشرت گیاوی'' کے نام سے ہے۔اس کے تحت مصنف نے غزلیات کا انتخاب ص۲۴۵ سے ۲۷۲ تک، رباعیات کا ص۲۷۳ سے ۲۸۴ تک، دیگر اصناف شاعری کا ص۲۸۴ سے ۲۹۰ تک،امیر مینائی وغیرہ کی غزلوں پر خمسے اور قطعات،ایک قطعہ تاریخ اور ایک سہرا شامل کیا ہے۔ ص۲۹۱ سے ۲۹۴ تک کتابیات ہے۔ سید حسن امام وارثی اور ہلال بنارسی وغیرہ عشرت کے مشہور تلامذہ اور شاد عظیم آبادی اور شوق نیموی وغیرہ ان کے معاصرین میں ہیں۔لیکن معاصرین کے تذکرہ میں مصنف نے عشرت گیاوی سے ان کے باہمی ربط و تعلق کی کوئی کڑی نہیں دکھائی ہے جس کے سبب یہ حصہ کتاب سے الگ اور زاید معلوم ہوتاہے۔ مصنف بلاشبہ تحقیقی و تنقیدی مزاج کے حامل اور معروضی مطالعہ کے علم بردار ہیں اور کتاب میں متعدد جگہوں پر اس کا اندازہ بھی ہوتاہے۔

البتہ کہیں کہیں بیانات میں تعارض اور مبالغہ بھی موجود ہے۔ ص۹۵ کے آخری پیراگراف کی عبارت

ص ۱۱۱ کے تیسرے اقتباس سے متعارض ہے۔ ص ۲۹۵ سے ۲۳۲ تک مصنف نے اپنی تصانیف پر مشاہیر کے حوصلہ افزا تبصروں اور ص ۲۳۳ سے ۲۳۶ تک اپنا سوانحی خاکہ درج کر دیا ہے۔ ایک خاص موضوع پر تحقیقی تصنیف میں تقریباً ۴۲ صفحات کا اضافہ خوامخواہ ایک طول عمل محسوس ہوتا ہے اور بلا ضرورت کتاب کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ مقدمہ نگار اور ان کے اپنے بیان کے مطابق ۱۹۹۳۔۱۹۹۴ء کے دوران دارالمصنفین کے لٹریری اسسٹنٹ بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ محترم، عبداللطیف اعظمی صاحب مرحوم کے ساتھ دارالمصنّفین تشریف لائے تھے۔ یہاں اس پوسٹ پر ان کا تقرر ضرور کیا گیا تھا لیکن جوائن نہیں کر سکے تھے۔ تصحیح اغلاط پر توجہ کی زیادہ ضرورت تھی۔ تاہم اس قسم کی کمیاں اس کی خوبیوں کو کم نہیں کر سکتیں۔

صفحات ادب : مولانا مفتی سید باقر ارشد۔ کاغذ طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۰۸، پتہ۔ المفتی ریسرچ اسٹڈی سرکل اینڈ پبلی کیشنز، محلہ مفتیان، ایس وائی مفتی روڈ نظامی چوک چن پٹن۔ قیمت: ۲۵۰ا روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء موبائل نمبر: ۹۸۴۵۳۶۷۴۴۳

مولانا مفتی سید باقر ارشد فاضل دیوبند کا تعلق چن پٹن، کرناٹک سے ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے بیان کے مطابق سوانح ،تذکرے، تبصرے تاریخ زبان وادب وادبیات پر مشتمل ادبی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ کرناٹک اردو اکیڈمی کی جانب سے شائع شدہ اس پر پروفیسر بی شیخ علی صاحب (سابق وائس چانسلر آف منگلور اینڈ گوا یونیورسٹی) کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے اس مجموعہ کو ''ادبی مقالات کا گلدستہ اور نعمت غیر مترقبہ'' سے تعبیر کیا ہے۔ (ص ۷) مقالات کی کل تعداد ۱۸ ہے۔ بعض مقالات ملک کے مختلف علمی وادبی سیمیناروں پیش کیے گئے ہیں۔ دیباچہ یا پیش لفظ کو ''انکشاف قلب'' کا نام دینا انوکھی تعبیر اور ''اقتباسات مقالات'' کے عنوان سے ص ۱۷ سے ص ۲۶ تک کتاب کے ہر مقالہ سے ایک ایک ادبی اقتباس اس مقصد سے نقل کرنا کہ ''قاری کے سامنے تالیف کا سرسری تعارف بھی ہو جائے اور ادبی ذائقات کا اندازہ بھی ہو جائے'' (ص ۱۷) مصنف کی جدت پسند طبیعت اور اعلیٰ ادبی ذوق کا مظہر ہے۔ حالانکہ بعض منتخب اقتباسات سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا۔ پہلا مقالہ سعدی شیرازی۔ فکر و فن اور آخری فعال حرکی وعبقری شخصیت۔ ڈاکٹر علی ملپا بھٹکلی پر ہے۔ گنج شائگاں، کلیات قصائد حضرت محمد علی ممکری آصف خانہ زاد پر تبصرہ بہت دلچسپ ہے۔ ادب اطفال: خدشات وامکانات، اردو مرثیہ نگاری میں رشتوں کی اہمیت، اردو نثر کا ارتقا دکن میں ،انسانی خدمت میں صحافت کا کردار کے عنوان سے مقالات کے تحت ان موضوعات پر ناقدانہ اور فکر انگیز گفتگو کی گئی ہے۔ ادب اطفال کے متعلق ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ آج بچوں میں اخذ وطلب معلومات کا انداز ڈیجیٹائزڈ ہو گیا ہے۔ بچے کتاب کے بجائے ای بک، گوگل، یوٹیوب، وکی پیڈیا سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس لیے یہ خدشہ یقینا بڑھ گیا ہے کہ مستقبل میں کتابیں محض لائبریری کی زینت نہ

بن جائیں۔ چنانچہ روایتی اور جدید دونوں طریقوں سے ان موضوعات کو ادب اطفال کا حصہ بنایا جانا ضروری ہے (ص ۱۴۵)۔اس ضمن میں ان کی تجاویز بھی کافی اہم ہیں۔ مصنف صحافت کو ایک معزز پیشہ اور اس کا بنیادی مقصد انسانیت اور عوام کی خدمت تصور کرتے ہیں۔اس لیے عوام کے لیے نقصان دہ قدم اٹھانا صحافت اور صحافی کے لیے ناجائز سمجھتے ہیں (ص ۱۷۵)۔ مواد کی پیشکش کے لیے ادبی اور شستہ و شگفتہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جس کے لیے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

البتہ جدید اسلوب و انداز کے مطابق حوالوں اور تصحیح اغلاط کے عدم اہتمام کی شکایت ضرور کی جاسکتی ہے۔ علامہ شبلی اور سید ابوالحسن علی ندوی والے مضامین میں چار چار صفحات کا خالی چھپ جانا طباعت کی طرف سے بالکل بے توجہی کو ظاہر کرتا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے ۱۹۱۵ء میں نکلنے والے ماہانہ رسالہ زبدۃ الملک کو ملت کا پہلا ماہانہ اردو رسالہ قرار دیا ہے (ص ۱۹) جو صحیح نہیں ہے۔اس سے کئی سال پہلے ۱۹۰۴ء میں اردو کا ماہانہ رسالہ الندوہ لکھنؤ علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے زیر ادارت نکل چکا تھا۔ عہد شبلی کے الندوہ کی عکسی کاپی نو جلدوں میں دارالمصنفین نے شبلی صدی کے موقع پر طبع کرادیا ہے۔

حریم لفظ و معنی: ظہیر حسن ظہیر۔ کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۵۶ پتہ: مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن، نعیم بک سیلر، مئو ناتھ بھنجن۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔ سن اشاعت: ۲۰۲۰ء موبائل نمبر:۔ ۸۷۳۶۹۹۲۸۱۰

زیر تبصرہ کتاب مصنف کے تاثراتی نوعیت کے مضامین کا مجموعہ ہے۔اس کے بیشتر مضامین ملک کے مختلف جرائد میں شائع اور متعدد سیمیناروں میں پیش کیے جاچکے ہیں۔ کل ۲۸ مقالات کو پانچ ابواب تحقیق وتدوین، شاعری اساس تنقید، اردو فکشن اور تنقید، تاریخ، خود نوشت اور متفرقات کے مرکزی عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں چھ مقالے ہیں۔ان میں دو تحقیق کے اصول، تدوین کے اصول و مسائل سے متعلق ہیں۔اس کے بعد تحقیق وتدوین کے چار معتبر اشخاص محمود شیرانی، امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی تحقیقی وتدوینی خدمات پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے باب کے تحت گیارہ مقالات میں میر تقی میر، اقبال سہیل، بیکل اتساہی، بسمل اعظمی، محفوظ الرحمن عادل، نیاز جیراج پوری، عنبر آفاقی، انیس منیری، نظیر اکبرآبادی، بسمل انصاری، نوشاد احمد کریمی کی نظموں، غزلوں، گیتوں اور نعتوں کے حوالہ سے ان کے کمالات شاعری کا جائزہ زیادہ تر ان کی شائع شدہ کتابوں یا دواوین کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ تیسرے باب کے چار مقالات میں پہلا مقالہ تقریباً ۱۸ صفحات میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی کتاب ''اردو کے چند فکشن نگار۔ تنقید و تجزیہ'' کے معروضی مطالعہ پر مشتمل ہے۔اس کے بعد عصمت چغتائی۔ ایک تاثر، شاکر کریمی کی افسانہ نگاری۔ ایک دن کا لمبا سفر کے تناظر میں اور اشتیاق سعید کے افسانہ ''اپنا خون''

کا اجمالی جائزہ کے نام سے مضامین ہیں۔ چوتھے باب کے تحت پروفیسر ضیاء الرحمن کی تالیف ''اردو ادب کی تاریخ'' کا معروضی مطالعہ اور اختر الایمان کی خود نوشت ''اس آباد خرابہ میں'' ایک مختصر جائزہ کے عنوان سے دو کتابوں پر مفصل تبصرہ ہے اور پانچویں باب میں ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی شخصیت اور مشہور شاعر منور رانا کی نثری رعنائی پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ منور صاحب پر مضمون میں حوالے درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ ایک مضمون مئو ناتھ بھنجن کے قدیم و جدید رسائل العلم، المعروف، ماہنامہ غالب، ہم چشم، ادب نکھار وغیرہ اور ان کی ادبی خدمات کے مختصر جائزہ پر ہے اور اس باب کے آخری دو مضمون میں سعید فریدی اور ایم نسیم اعظمی کی وفات کے بعد ان کی یادوں کو نہایت سلیقہ سے سمیٹ کر حوالۂ قارئین کر دیا ہے۔

مصنف کا شمار مئو کے جواں سال اور ہونہار مصنفین میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مرحوم کے تربیت یافتہ ہیں۔ سادہ، عام فہم اور سلیس و رواں اردو لکھتے ہیں۔ ادب و تنقید اور تحقیق و تدوین کے موضوعات اور اس سلسلہ کی معتبر شخصیات پر مضامین سے قطع نظر انہوں نے نسبتاً کم مشہور اور عصر حاضر کے بعض ادبا و شعرا پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ یہی مضامین دراصل ان کے انداز نقد و نظر کا معیار طے کرتے اور ان کو اہل علم کے التفات نظر کا مستحق بناتے ہیں۔ البتہ بعض روشن خیال ادبا اور غیر مسلم محققین کی تقلید میں شعری وادبی ''تحقیق'' کو اسلام کی خاص اصطلاح ''اجتہاد'' اور محقق کو ''مجتہد'' سے تعبیر کرنا (ص ۱۲) یا دونوں لفظوں کو مترادف اور ہم معنی یا دونوں کے کار تحقیق کو ہم مرتبہ سمجھنا یا سمجھانا جس کی دین میں اپنی الگ اہمیت و معنویت ہے تعبیر کی غلطی ہے اور یقیناً عربی کے اس مشہور اور سچے مقولہ ''ولکل مقال مجال'' اور ''حریم لفظ و معنی'' کے تصور کے خلاف بھی ہے۔ کتاب کے ہر صفحہ کی پیشانی پر مصنف کے نام لکھنے یا دوسرے لفظوں میں ''نام نمائی'' کی اس حالیہ روایت سے پرہیز ہمارے خیال میں زیادہ موزوں تھا۔ موضوعات میں یکسانیت کے سبب بعض مضامین میں جملوں کی تکرار در آئی ہے۔ صفحہ ۱۱۵ پر لفظ تاہم کا استعمال بھی صحیح نہیں ہو سکا ہے۔ صفحہ ۳۳ پر جزئیات کا املا جزیات صفحہ ۳۴ پر دو جگہ ''مع مقدمہ حواشی کے ساتھ'' پہلے لفظ مع یا آخری لفظ ساتھ کے زاید یا غلط ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں ہے۔ بہر حال ادبی، تنقیدی اور سوانحی تینوں حیثیتوں سے یہ مضامین اصحاب ذوق کے لیے لائق مطالعہ ہیں (ک۔ ص اصلاحی)۔

مسلمانوں کی تکفیر کے رد میں رسالہ: دبی (متحدہ عرب امارات) کے مرکز جمعہ الماجد کے تحقیقی سہ ماہی مجلہ آفاق الثقافۃ والتراث نے ربیع الآخر ۱۴۴۳ھ، دسمبر ۲۰۲۱ کے شمارے میں شامی عالم عبدالغنی بن شاکر السادات الدمشقی الحنفی (۱۲۰۰۔۱۲۶۵ھ) کے رسالہ نشر الخُزام فی المحاماۃ عن تکفیر أھل الاسلام کو شائع کیا ہے جس کی ایڈیٹنگ ڈاکٹر طہ محمد فارس نے کی ہے۔ یہ رسالہ مذکورہ مجلہ کے صفحات ۱۰۹۔۱۷۹ پر شائع ہوا ہے۔ اس رسالے کی تصنیف کا سبب یہ ہے کہ شام کے ایک آدمی نے اپنی بیوی سے غصے میں اس کے دین و ایمان کو

گالی دے دی۔اس کی شکایت مذکورہ خاتون نے قاضی سے کی۔شوہر نے دین وایمان کو گالی دینے سے انکار کیا لیکن بیوی نے اپنے دعوی کی تایید میں گواہ پیش کئے، جس کی بنیاد پر قاضی نے اس شخص کے کفر کا فیصلہ کر دیا اور مذکورہ بیوی سے اس کی شادی فسخ کر دی۔پھر یہ مسئلہ شام کی اعلی کاؤنسل ''مجلس شوری الشام'' میں پیش ہوا۔وہاں مصنفِ رسالہ نے تکفیر کے مسئلے پر بحث کی اور یہ کہا کہ غلط کار شوہر کی تعزیر (حد سے کم سزا) ہونی جائے،اس کو توبہ واستغفار کا حکم دینا چاہئے اور احتیاطاً اس کے نکاح کی تجدید کر دینی چاہئے۔واقعہ کے صحیح نہ ہونے کے احتمال اور فقہاء کے درمیان اس مسئلے پر اختلاف کی وجہ سے حاکم کو ایسے غلط کار کے کافر ہونے کا حکم نہیں دینا چاہئے اور نہ ہی اس کا نکاح فسخ کرنا چاہئے۔ مذکورہ رسالہ کو مفسر قرآن محمود الآلوسی (م:۱۲۷۰ھ) نے پسند کیا اور اس پر اپنی تقریظ لکھی۔یہ رسالہ یہاں دیکھا جاسکتا ہے:
http://almajidcenter.org/publications.php

مذکورہ واقعے سے قطع نظر،اس مسئلے کی اپنی مستقل اہمیت ہے اور آج بھی چھوٹی چھوٹی باتوں اور افعال کو بنیاد بنا کر بعض مفتیان لوگوں کی تکفیر کا فتوی آسانی سے صادر کرتے رہتے ہیں۔امام ابو حامد الغزالی نے اپنے رسالہ فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة میں اس رویے کی شدید مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ فقیہ کو یہ اختیار نہیں حاصل ہے کہ وہ لوگوں کی آسانی سے تکفیر کر دے (ظ۔اَ۔خ)۔

ادبیات

ڈاکٹر جمیل مانوی

سہارن پور۔یو.پی(انڈیا)

صدیوں کی محنتوں کا شجر بے ثمر ہے آج
''گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج''

مانا کہ اہل حق کی صدا بے اثر ہے آج
چپ ہے زمانہ ، یہ نہ سمجھ ، بے خبر ہے آج

کوتاہیِ عمل کے سوا اور کیا کہوں
بدلی ہوئی جو اہل جہاں کی نظر ہے آج

قدریں بدل گئی ہیں ، زمانہ بدل گیا
معیارِ خیر و شر بھی تو زیر و زبر ہے آج

اہلِ ہنر کی قدر نہ کل تھی ، نہ آج ہے
مسند نشینِ علم ہر اک بے ہنر ہے آج

کس کو پڑی ہے جانے ، کہ سچ کیا ہے جھوٹ کیا
جو بات آپ کہہ دیں وہی معتبر ہے آج

توفیق ہو تو ، اب بھی مرے من کی بات سن
آمادۂ کلام مری چشم تر ہے آج

یہ نقش اہل دل کے ہیں ، یہ مٹ نہ پائیں گے
گو دسترس میں تیری ہر اک بحر و بر ہے آج

میں جتنا اجنبی ہوں ترے دل کے واسطے
اتنا ہی بے نیاز ترا سنگِ در ہے آج

یارب کسی کے ٹوٹے ہوئے دل کی خیر ہو
سنتے ہیں جذبِ دل سے کوئی بے خبر ہے آج

یہ بھی جمیلؔ تیرے بزرگوں کا فیض ہے
روشن ترے ہنر سے ہر اک رہ گذر ہے آج

معارف کی ڈاک

(۱)

تفسیر ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد پر تبصرہ

معارف کا تازہ شمار فروری ۲۰۲۲ء میرے پیش نظر ہے۔اس شمارہ میں صفحہ نمبر ۱۰۷ پر تفسیر ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد پر تبصرہ شائع ہوا ہے جو ملک زادہ منظور احمد صاحب کے خیالات پر مشتمل ہے۔ ترجمان القرآن پر اظہار خیال بقلم ملک زادہ منظور احمد غیر مناسب اور ناقابل اعتبار ہے ۔ملک زادہ منظور احمد مشاعروں کے ناظم اور اردو کے شاعر ہیں، ان کا یہ مقام نہیں ہے کہ ان کے خیالات قرآن مجید جیسی عظیم کتاب کے بارے میں معارف میں قابل اشاعت قرار دیئے جائیں۔ دو باتوں کا تذکرہ کرتا ہوں:

۱۔ صفحہ ۱۲۰ پر سیرۃ النبی جلد چہارم مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی کا حوالہ دیا گیا جس سے کوئی بات واضح نہیں ہوتی۔

۲۔ دوسری بات صفحہ ۱۲۵ پر وحدت ادیان کے بارے میں ہے۔اس کی تاویل کی گئی ہے جو گمراہ کن ہے۔ اس طرح کے دینی مباحث پر کلام کرنا ہر کسی کے لئے مناسب نہیں۔ نظریہ وحدت ادیان آزادئ ہند کے بعد مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے گاندھی جی نے ایجاد کیا تھا۔ وحدت ادیان کی تردید میں اسلامی لٹریچر مالا مال ہے۔

اس مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ تحریر ملک زادہ صاحب کے زمانہ طالب علمی کی ہے، ملاحظہ ہو معارف مذکور کا صفحہ ۱۲۶۔

اس مضمون کی اشاعت معارف کے معیار کی نہیں ہے۔

نظام الدین اصلاحی
چاند پٹی، اعظم گڑھ
osamafalahi999@gmail.com

(۲)

اردو اور فارسی لغت نویسی کا ارتقائی سفر

معارف، مارچ ۲۰۲۲ پیش نظر ہے۔ اس میں ایک مضمون ”ہندوستان میں اردو اور فارسی لغت نویسی کا ارتقائی سفر“ دیکھا۔ مضمون دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ اولاً یہ موضوع دو الگ الگ مضمونوں کا متقاضی ہے بلکہ اگر انصاف سے کام لیا جائے تو دو الگ الگ تحقیقی کتابوں کا موضوع ہے اور اس موضوع پر کتابیں لکھی

بھی جاچکی ہیں۔ لیکن فاضل مضمون نگار نے دونوں کو یکجا کر کے موضوع سے انصاف نہیں کیا۔ ثانیاً مضمون میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تاریخی تناظر میں پہلے فارسی کو رکھا جاتا پھر اردو کو، کیونکہ ہندوستان میں اردو لغت نویسی سے پہلے فارسی لغت نویسی شروع ہوئی اور اسی کے بطن سے اردو لغت نویسی نے جنم لیا۔ اردو لغات کی ابتدائی فرہنگوں (جیسے غرائب اللغات، کمال عترت) میں اردو الفاظ کی توضیح فارسی میں لکھی گئی ہے۔ مضمون نویس نے نہ صرف ترتیب معکوس کر دی ہے بلکہ اردو مضمون کے بیچوں بیچ فارسی کو داخل کیا ہے اور فارسی لغات کے بعد پھر اردو لغات کا تذکرہ شروع کر دیا ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ فارسی لغات کو محض آدھے آدھے دو صفحوں میں نمٹا دیا ہے (ص ۱۷۸۔۱۷۹) اور اس میں بھی فارسی لغت نویسی کے ارتقائی سفر کو چھوڑ کر سیدھے اٹھارویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی ٹیک چند بہار کی بہار عجم پر آ گئے ہیں حالانکہ بہار عجم سے قبل ہندوستان میں فارسی فرہنگ نویسی کا ایک طویل سفر ہے۔ اس کے بعد مضمون نگار صرف آصف اللغات کا دو سطری ذکر کر کے گویا ''فارسی لغات نویسی کے ارتقائی سفر'' پر تحقیق کے فرض کفایہ سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ مضمون نگار کا یہ کہنا کہ بہار عجم کے ۱۲۸۲ھ دہلی ایڈیشن پر غیاث اللغات کے مصنف محمد غیاث الدین رامپوری نے حواشی تحریر کیے ہیں، صریح غلط فہمی پر مبنی ہے۔ بہار عجم پر غیاث رامپوری نے حواشی تحریر نہیں کیے بلکہ اس ایڈیشن کے حوض میں بہار عجم اور حاشیے میں غیاث اللغات چھپی ہے۔ قدیم طابعین اور ناشرین دو کتابیں یکجا چھاپنے کے لیے یہ طریقہ اپناتے تھے۔ اردو فرہنگوں کے معاملے میں بھی مضمون نویس پاکستان میں تدوین اور چھپنے والی کئی فرہنگوں سے بے خبر ہیں۔ مجھے اس مضمون میں اردو لغت بورڈ کراچی کی مرتبہ اردو لغت تاریخی اصول پر کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا جو اس وقت اردو کی جامع ترین لغت ہے۔ مضمون نگار نے ایک جگہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ نوادر الالفاظ کو نوادر اللغات لکھا ہے (ص ۱۷۴)، یہ سہو قلم ہے۔ غرض فارسی لغات کی حد تک اس مضمون میں حق تحقیق ادا نہیں کیا گیا اور مضمون کے عنوان میں ''فارسی'' کو شامل کرنا محض تکلف ہے۔

عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد
naushahiarif@gmail.com

(۳)

معارف میں تبدیلی

معارف فروری ۲۲ء میں شعر کے تعلق سے مرسلہ مکتوب کی اشاعت کا شکر گزار ہوں۔ نومبر ۲۱ء کا شمارہ ہی معارف کی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد کے شمارے تو نئے سانچے اور ڈھانچے میں ہم دست

ہو کر اس کے قلب ماہیت کی تعبیر پیش کرنے لگے۔ خاکم بدہن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تبدیلی کے وائرس کا شکار ہو جائے۔ جناب ڈاکٹر شفقت اعظمی صاحب کے مکتوب گرامی کے دیے گئے جواب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ معارف کے حالیہ مروجہ فونٹ میں تبدیلی ناممکن ہے۔ کیوں کہ اس کے تعلق سے اختیار کردہ رویے اور پیش کردہ نظریے اس کی غمازی کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ کمزور بصارت والے قارئین کے لیے یہ مسئلہ پیدا کرنے والا اخباری انداز کتابت ہے۔ بصورت دیگر یہ اس سے دوری اور کنارہ کشی کا موجب و محرک ہے۔ ایسے شائقین اور دلدادگانِ معارف یہ کہنے پر مجبور ہیں:

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

آنجناب سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ قاری اساس تحریر اور اساس تنقید ہوتے ہیں۔ اردو کے ادبی رسائل کے لاینحل مسائل میں نئے خریدار قارئین کا نہ ہونا بھی ہے۔ بنابریں یہ رسالے زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

معارف تو خیر ایک مخصوص "نوائے عاشقانہ" اور منفرد "ادائے دلبرانہ" کا رسالہ ہے۔ اس لیے اس کے قارئین کا مسئلہ تو اور بھی جداگانہ نوعیت کا ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ معارف علامہ شبلی کی ایک ایسی حسین فکری شمع ہے جس کے ارد گرد علم و فن کے پروانے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ اس کی علم پروری، ادب نوازی اور عشوہ سنجی پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے:

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
دوج کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

اسی لیے اس کے قارئین کے حلقے کی توسیع کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔

بہر کیف زندگی نام ہے تبدیلیوں کا۔ کیوں کہ

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لیکن خوش کن تبدیلی وہ ہوتی ہے جس میں روایت کی پاسداری بھی ہو اور اس سے بغاوت بھی۔ دوسرے

لفظوں میں وہ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' درخشاں خیال ہو۔اس سلسلے میں ایک اچھی تبدیلی دیکھنے کو یہ ملتی ہے کہ اب معارف میں شائع ہونے والے مقالات کے حوالہ جات صفحہ وار ہوگئے نیز مقالہ نگاروں کے تعارف کا شروع کیا جانے والا سلسلہ بھی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ پہلے بھی ان کے ذریعے دیے گئے نام وپتے سے اس کا اندازہ ہو جاتا تھا لیکن اب باقاعدہ ہو جانے سے اور اچھا ہو جائے گا۔اسی کے ساتھ دیگر صحت مند تبدیلیوں کے متعلق اظہار کردہ نیک خواہشات کا خیر مقدم بھی ہے۔

جہاں تک باب التقریظ والانتقاد اور مطبوعات جدیدہ کا تبصرہ کتب میں انضمام اور نام دیے جانے کی بات ہے تو اس بابت عرض ہے کہ یہ کچھ اچھا سا نہیں ہے۔اس لیے ان دونوں کالموں کی شاندار روایات کی پاسداری ضروری ہے۔اب رہی بات دوسرے اہل قلم کی حق تلفی کی تو اس سے بچنے کے لیے ''باب التقریظ والانتقاد'' کی میعاد مقرر کردی جائے۔ویسے بھی یہ کالم ہر شمارے میں آتا نہیں ہے۔

اسی طرح ''مطبوعات جدیدہ'' کو بھی تبصرہ کتب سے معنون کرنا اچھا نہیں ہے۔کیوں کہ ہر رسالے کا اپنا ایک مزاج ومنہاج ہوتا ہے جس سے وہ دوسرے رسائل سے ممتاز ہوتا ہے۔معارف بھی اس سے جدا نہیں۔اس کے امتیازی تشخص اور جداگانہ شناخت میں نگارشات وکاوشات کے لیے عنوانات کا منفرد انتخاب بھی ہے جو شاعر معارف جناب وارث ریاضی صاحب کے اس شعر کا مصداق ہے:

دلکش ہے، لاجواب ہے میری نگاہ میں
وہ حسن انتخاب ہے میری نگاہ میں

اس لیے معارف کے تفرد وتحفظ کے لیے انہی عنوانات کا استعمال ناگزیر ہے اور ان کی رعایت نہایت ضروری ہے۔

تبصرہ کے لیے موصول ہونے والی کتابوں کے تعلق سے پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب کے قیمتی منصوبے پر عمل پیرا ہونے کی یقین دہانی خوش آگیں ہے۔اگر میری قوت حافظہ خطا نہ کر رہی ہو تو میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ رسید کتب موصولہ انہی کا دیا ہوا عنوان ہے

راجو خان

بیگو سرائے

9122780198

(۴)

شبلی اکیڈمی کی لائبریری

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی رفتارِ ترقی سے متعلق آپ کی رپورٹ[1] موصول ہوئی اور اسے پڑھ کر خاص طور سے اکیڈمی کی لائبریری کی نئی بلڈنگ کے منصوبے کے بارے میں جان کر مسرت ہوئی۔ بلاشبہ (جیسا کہ آپ بھی اس سے بخوبی واقف ہیں کہ) کسی بھی تعلیمی یا علمی ادارہ کے لئے کتب خانہ یا لائبریری کی حیثیت رگِ جاں (Life Line) کی ہوتی ہے۔ اس کی بہتری اور توسیع و ترقی کے لئے جو بھی مناسب قدم اٹھایا جائے ان شاء اللہ تعالیٰ مفید ثابت ہوگا۔ اللہ رب العزت اس منصوبہ کی تکمیل کے اسباب مہیا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ لائبریری بلڈنگ فنڈ میں جلد ہی یہ مکتوب نگار ایک قلیل عطیہ بھیج دے گا۔ امید کہ اکیڈمی کے ذمہ داران اسے قبول فرمائیں گے۔

لائبریری میں محفوظ شبلی اکیڈمی کی مطبوعات کے سلسلہ میں ناچیز کی ایک تجویز ہے کہ اکیڈمی سے مطبوعہ ہر کتاب کے پہلے ایڈیشن کی ایک کاپی ایک الگ الماری میں ریکارڈ کے طور پر محفوظ کر دی جائے، اس سے شائقینِ کتب اور محققین کو استفادہ میں آسانی ہوگی۔ اس تجویز کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات اکیڈمی کی کسی کتاب کے اولین ایڈیشن کے سنِ اشاعت یا دوسری تفصیلات جاننے کے بارے میں معلومات طلب کرنے پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے تلاش کرنے میں لائبریری اسٹاف کو دشواری ہوتی ہے اور بعض دفعہ تو مطلوبہ کتاب کا پہلا ایڈیشن مل بھی نہیں پاتا۔ اس تجویز کو منظور کئے جانے کی صورت میں بہتر ہوگا کہ لائبریری کے ذخیرہ میں اکیڈمی کی قدیم مطبوعات میں جس کتاب کا بھی پہلا ایڈیشن مل جائے اسے عام ذخیرہ سے الگ کر کے محفوظ کر دیا جائے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

علی گڑھ

zafarul.islam@gmail.com

۱۔ یہ رپورٹ ناظم کی طرف سے شبلی اکیڈمی ٹرسٹ کے ممبران کو بھیجی گئی۔

دارالمصنّفین کے لیل ونہار

فروری ۲۰۲۲ء کے وسط میں ڈاکٹر ظفرالاسلام خان ناظم دارالمصنفین ۱۰؍دن کے لیے یہاں آئے۔ دوران قیام انہوں نے محفوظہ میں رکھے گئے مخطوطات بالخصوص مولاناسید ریاست علی ندوی مرحوم کے علمی متروکات کا معائنہ کیاجن کوپروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب سابق ناظم دارالمصنفین نےان کے صاحب زادے سید اشہد علی مرحوم ایڈوکیٹ سے حاصل کیاتھا۔ پچھلے سال بارش سے پہنچنے والے نقصانات کا جائزہ لینے کے بعدان کومزید سکھانے کی تاکید کی اور راقم سطور کوان تمام مسودات کی موجودہ صورت حال اور لائق اشاعت مضامین اور کتابوں کی نشاندہی پر تفصیلی رپورٹ تیار کرنے کی تحریری ہدایت کی اور کہا کہ دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق ماہانہ رپورٹ سے مطلع کرتے رہیں۔ معارف سے متعلق ایک بات یہ بھی کہی کہ آئندہ ہر شمارے کی اشاعت کے بعد اخبارات میں دینے کے لیے اس کے مشمولات سے متعلق ایک مختصر رپورٹ بھی تیار کردیا کریں۔ چنانچہ مارچ ۲۰۲۲ء کی مختصر رپورٹ بھیجی جاچکی ہے۔

اس کے بعد شعبۂ علمی وانتظامی میں چل رہے کاموں کا جائزہ لیا۔رفقائے دارالمصنفین کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ تحقیقی کاموں کی تکمیل کے لیے کتابوں اورجدید ضروری وسائل انٹرنٹ وغیرہ کی ہمہ وقت سہولت فراہم کرنے اور رفقااور آفس کے بعض عملہ کواپنی اپنی ضرورت کے مطابق کمپیوٹر سکھانے کے لیےایک جزوقتی ٹرینر رکھنے کی ہدایت بھی کی۔لائبریری میں ۱۰؍الماریاں منگوانے کاحکم دیا۔

مختلف موضوعات پر معارف کے اہم مضامین کوکتابی صورت میں شائع کرنے کا تقاضہ اہل علم وتحقیق کی جانب سے بہت پہلے سے ہوتا رہاہے۔پروفیسر ظلی صاحب کے پیش نظر یہ منصوبہ بھی تھاتاہم روبہ عمل نہ آسکا تھا۔نئے ناظم نے الحمدللہ اس کی تکمیل کا ترجیحی طور پر بیڑااٹھایاہے۔ سردست ان مضامین کی موضوعاتی فہرست تیار کرنااس جانب پہلا قدم ہے۔ فہرست سازی کے لیےایک کارڈ تیار کرکے اپنی موجودگی ہی میں طبع کرایا۔ کارڈ میں مطلوبہ معلومات درج کرنے کا کام شروع ہوگیاہے۔اپنے ادارہ چیریٹی الائنس کی جانب سے چار کمپیوٹر دو شعبۂ علمی اور دو شعبۂ انتظامی کے لیے مہیا کرائے۔پرانے کمپیوٹر کو حسب ضرورت فارمیٹ اوراپڈیٹ کرایا گیاہے۔

دارالمصنفین کے لیے مالی وسائل کی فراہمی اور مستقل ذرائع آمدنی کی تلاش وجستجو کا مسئلہ شروع سے ہی رہا ہے۔اس کے لیے بہت سی سنجیدہ اور باوقار کوششیں کی جاتی رہی ہیں مثلاً ادارہ کے لائف ممبر اور کتابوں کی فروخت اور معارف کی ممبر سازی کی مہمیں چلائی جاتی رہی ہیں لیکن یہ کوئی پائیدار حل نہیں تھا۔ چنانچہ انتظامیہ نے کوچنگ سینٹر کے قیام، لب روڈ کمروں کودکانوں میں تبدیل کرنے اور باغ کی طرف خالی جگہ پر کمیونیٹی ہال تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔اسٹاف کی رہائش کے لیے ادارے کی مسجد اور آفس کے درمیان مکانات بھی زیر تعمیر ہیں۔

(ک۔ص۔اصلاحی)

رسید کتب موصولہ

بابری مسجد آنکھوں دیکھا حال: معصوم مرادآبادی، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، صفحات ۲۴۰، سالِ اشاعت ۲۰۲۰ء قیمت: ۲۵۰؍ روپے۔

باتیں سخن کی: ڈاکٹر عمیر منظر، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ صفحات ۱۹۲، سالِ اشاعت: ۲۰۱۸ء، قیمت: ۲۹۹؍ روپے

جہانِ ادب کے سیاح ڈاکٹر امام اعظم: ڈاکٹر خالد حسین خاں، بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ، صفحات ۱۱۲، سالِ اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۱۵۰؍ روپے

خان محبوب طرزی - لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار: مرتب: ڈاکٹر عمیر منظر، دانش محل، امین آباد لکھنؤ، صفحات ۴۴۶، سال اشاعت ۲۰۲۰ء قیمت ۴۲۵؍ روپے

دُر معنی: ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ ناگپور، (مہاراشٹرا)۔ صفحات ۳۳۶، سال اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۰۳؍ روپے۔

علامہ شبلی کے فارسی خطوط-ایک مطالعہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، صفحات ۱۲۸، سال اشاعت: ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۵۰؍ روپے

مولانا افتخار فریدیؒ-حیات وخدمات: معصوم مرادآبادی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات ۲۱۶، سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت: ۲۵۰؍ روپے

مولانا عبدالرحمن ناصر اصلاحی جامعی - شخص وشخصیت: پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، براؤن بکس شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، صفحات ۲۰۰، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۳۰۰؍ روپے۔

مولانا محمد علی جوہر آنکھوں دیکھی باتیں: محمد عبدالملک جامعی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، صفحات ۲۱۶، سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت ۳۰۰؍ روپے۔

نقوشِ آگہی: وارث ریاضی، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ (بہار) صفحات ۳۳۲، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۳۰۰؍ روپے۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۴ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبروار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000
موازنہ انیس و دبیر	350
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30
الفاروق	350
الغزالی	300
المامون	175
سیرۃ النعمان	300
سوانح مولانا روم	220
شعر العجم (اول)	250
شعر العجم (دوم)	150
شعر العجم (سوم)	125
شعر العجم (چہارم)	200
شعر العجم (پنجم)	150
مکاتیب شبلی (اول)	150
مکاتیب شبلی (دوم)	190
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350
خطبات شبلی	150
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100
سفر نامہ روم و مصر و شام	200
کلیات شبلی (اردو)	220
کلیات فارسی (فارسی)	--
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170
مقالات شبلی دوم (ادبی)	70
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	110
الندوہ (۹ جلدیں)	4735
اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250
الکلام	250
علم الکلام	200
انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200

ISSN 0974-7346 Maarif (Urdu) Print **APRIL 2022** Vol. 209/4

RNI No. 13667/57 AZM/NP-43/022

MAARIF

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

تابعین	شاہ معین الدین احمد ندوی	250/-
تبع تابعین (اول)	مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی	230/-
تبع تابعین (دوم)	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی	320/-
سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندویؒ	220/-
حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندویؒ	650/-
شبلی ایک دبستان	آفتاب احمد صدیقی	250/-
یادرفتگاں	مولانا سید سلیمان ندوی	350/-
بزم رفتگاں (اول)	سید صباح الدین عبدالرحمن	240/-
تذکرۃ الفقہا (اول)	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلی	330/-
علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
عہد اورنگ زیب میں علماء کی خدمات	ڈاکٹر علاؤالدین خاں	380/-
شذرات سرسید	اصغر عباس	500/-
تصانیف سرسید	پروفیسر الطاف احمد اعظمی	300/-
مرزا دبیر کی شاعری	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	150/-
آثار شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-
افکار عصریہ	ترجمہ: محمد نصیر احمد عثمانی	300/-
ارمغان سلیمان	مولانا سید سلیمان ندوی	250/-
دارالمصنفین کے معمار رفقاء اور خدمات	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	800/-
بزم دانشوراں	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی	425/-